اُردو کا کلاسیکی ادب

نیرنگِ خیال

از

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

مرتب

ڈاکٹر محمد صادق

مجلسِ ترقی ادب ○ لاہور

بعونِ صناعِ مکین و مکاں بفضلِ خلاقِ زمین و زماں

۱۶۲

اردو کا کلاسیکی ادب

نیرنگِ خیال

از

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

مرتب

ڈاکٹر محمد صادق

ناشر

مجلسِ ترقیِ ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

فہرست

مقدمہ: ڈاکٹر محمد صادق ۷
دیباچہ: مولانا محمد حسین آزاد ۴۷
۱۔ اُردو، انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات ۵۱
وقت ۵۶
غصہ ۵۷
عشق ۵۷
افواہِ شہرت ۵۷
حسن کی پری ۵۷
۲۔ آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا ۶۱
دیکھو اب انسان کی نیت میں فرق آتا ہے اور کیا جلد اس کی سزا پاتا ہے ۶۲
جہاں لوٹ مار اور غارت و تاراج کا قدم آئے، وہاں احتیاج اور افلاس نہ ہو تو کیا ہو ۶۲
اب پچھتانے سے کیا حاصل ہے، ہاں ہمت کرو اور محنت پر کمر باندھو ۶۳
اے حضرتِ انسان! قدرتی گلزاروں کی بہار تو دیکھ چکے، اب اپنی دست کاریوں کی گل کاری دیکھو ۶۴
اے محنت کش! محنت کی بھی ایک حد ہے، آخر ایسا تھکو گے کہ گر پڑو گے ۶۵
جو آسائش کے قدرتی سامان تھے وہ اپنے ہاتھوں کھوئے، اب محنت کے بنائے ہوئے سامانوں سے آرام چاہتے؟ نہ ہو گا نہ ہو گا ۶۶
آرام کے بندو! دیکھو بہت آرام بہت سی خرابیاں پیدا کرتا ہے ۶۶
عیش کے بندے جب حد سے زیادہ دق ہوئے تو طبیب کیا خوب ڈھونڈا! ۶۷
محنت کش ہزار ہمت کرے، مگر کوئی نہ کوئی دشمن اُس کے پیچھے بھی لگا ہوا ہے ۶۸

حق یہ ہیں کہ آرام کا مزہ بھی محنت کے بغیر نہیں، اب ذرا محنت کا لطف دیکھو ۶۸
جب آرام اور محنت دونوں اعتدال سے ہوں تو کیوں صحت حاصل نہ ہو ۶۸
۳۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ۷۱
۴۔ گلشنِ اُمید کی بہار ۷۷
باغِ اُمید کے دو دروازے ۸۱
۵۔ سیرِ زندگی ۸۵
۶۔ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا ۹۳
۷۔ علوم کی بدنصیبی ۹۹
تمہید ۹۹
آغازِ مطلب ۱۰۰
اب اہلِ نظر غباری عینکیں لگالیں کے بے کمالوں کے دلوں کے غبار آندھی ہو کر اٹھتے ہیں۔اُن کے اقبال کا دور آیا ۱۰۲
جب پروردگار کسی بندۂ خاص کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے بندہ کے کام اُس کے سپرد کرتا ہے، خواہ مخواہ کے خیر خواہ مشورت دینے کو بہت پیدا ہو جاتے ہیں ۱۰۳
جب ارکانِ سلطنت کی بے اعتدالیاں حد سے گزر جائیں، تو اہلِ فساد کیوں سر نہ اٹھائیں ۱۰۴
حضرتِ انسان کا قاعدہ ہے جب اپنے اوج پر آتے ہیں تو اصلیت کو بھول جاتے ہیں ۱۰۴
جب دربار کا رنگ بگڑتا ہے تو غرض مندوں کے خیالات اس سے بگڑ جاتے ہیں ۱۰۵
حق داروں کا حق کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے، مگر نہ اس قدر کہ طوفانِ نوح کا مقابلہ کر سکے ۱۰۶
طوفانِ بے تہذیبی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے ۱۰۶
دیکھو! صبح کا راستہ بھولے ہوئے شام کو گھر آتے ہیں ۱۰۷
۸۔ علمیت اور ذکاوت کے مقابلے ۱۰۹

	تمہید	۱۰۹
	صورتِ معرکہ	۱۱۰
	مناظرے کے شوقینو! دیکھو، اب دونوں حریف اپنی اپنی چال چوکتے ہیں	۱۱۳
	خوش بیانو! دیکھنا، طنز و تعریض کی نہ ٹھہرے، نہیں تو خواہ مخواہ لڑائی ہو پڑے گی	۱۱۴
۹۔	شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار	۱۱۹
۱۰۔	جنّتُ الحمقا	۱۳۵
	تمہید	۱۳۵
۱۱۔	خوش طبعی	۱۳۵
۱۲۔	نکتہ چینی	۱۴۹
	نکتہ چین ناانصاف کی بدولت تصنیف کا کیا حال ہوتا ہے	۱۴۹
	داستان	۱۵۱
۱۳۔	مرقعِ خوش بیانی	۱۵۵
	خوش بیانی کا مرقع اور فصاحتِ اصلی و نقلی کی جنگ	۱۵۵
۱۴۔	سیرِ عدم	۱۶۱
	مسافرانِ عدم کے پسماندوں کی سرگزشت	۱۶۱
۱۵۔	حواشی	۱۶۷

مقدمہ

محمد حسین آزاد ۱۰۔ جولائی ۱۸۳۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد باقر تھا جنھوں نے ۱۸۳۶ء میں دہلی اُردو اخبار جاری کر کے شمالی ہندستان میں اُردو صحافت کی بنیاد ڈالی۔ اُن دنوں دہلی کالج کا بہت چرچا تھا، چناں چہ ابتدائی تعلیم کے بعد آزاد ۱۸۴۷ء کے قریب اس کے شعبۂ مشرقی میں بہ حیثیت طالب علم داخل ہوئے اور چار سال زیرِ تعلیم رہے۔ وہاں مشرقی علوم کے علاوہ اُنھوں نے جدید مغربی علوم کا بھی مطالعہ کیا، جس سے اُن کے خیالات میں وسعت، فکر میں آزادی اور معلومات میں اضافہ ہوا۔ چناں چہ غدر کے بعد جب اُنھوں نے لاہور میں اپنے تئیں ایک ایسے ماحول میں پایا، جس میں مغربی اثرات سے ایک نئی زندگی کی تشکیل ہو رہی تھی تو اُنھوں نے اس فضا کو نہ صرف اپنی طبیعت کے موافق پایا، بل کہ اسے آگے بڑھانے میں ایک اہم کردار بھی ادا کیا۔

شاعری میں اُنھیں ذوقؔ سے تلمذ تھا، جن سے ان کے والد کے گہرے اور دیرینہ مراسم تھے۔ آزادؔ کا بہت سا وقت ذوقؔ کی صحبت میں گزرتا۔ یہاں انھیں قدیم اور معاصر شعرا کی معرکہ آرائیاں، قصّے کہانیاں اور روودادِ حیات سننے میں آتی۔ یہ مواد اُن کے حافظے میں بہ تدریج محفوظ ہوتا رہا اور دیگر معلومات سے مل کر آخرکار آبِ حیات کی صورت میں نمودار ہوا۔

آزادؔ کی تصانیف میں یہ دونوں عناصر متوازی طور پر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں اگر ایک طرف وہ جدید علوم اور اصلاحِ معاشرت کی حمایت میں تھے تو دوسری طرف اُنھیں ماضی سے فطری لگاؤ بھی تھا۔ جذبے اور فکر کا یہ تلازم ان کی تصانیف کا ایک اہم پہلو ہے۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد آزادؔ کچھ عرصہ دہلی اُردو اخبار کے مدیر بھی رہے۔ جنگِ آزادی کے دوران میں ان کے والد نے حریّت پسندوں کا ساتھ دیا۔ چناں چہ جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو اُنھیں بغاوت کے جرم میں سزائے موت ملی۔

جنگِ آزادی میں آزادؔ نے بھی حصہ لیا تھا۔ چناں چہ ان کے والد کی گرفتاری کے جلد ہی بعد ان کی گرفتاری کے احکام بھی جاری ہوئے، لیکن یہ بروقت دہلی سے بھاگ نکلے اور چار سال نہایت شکستہ حالی اور مالی اور ذہنی پریشانی میں بسر کر کے لاہور آئے، جہاں اُنھیں ڈاک خانے میں ایک معمولی سی

ملازمت مل گئی۔ لاہور میں اُن دنوں ان کے ایک پرانے مہربان "پنڈت من پھول" لاٹ صاحب کے میر منشی تھے۔ ان کی سفارش پر ۱۸۶۴ء میں وہ محکمہ تعلیم سے منسلک ہوئے اور یہیں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

پنجاب میں جدید مغربی تعلیم کا آغاز و رواج ڈاکٹر لائٹز رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ آپ ایک مشہور مستشرق تھے اور ایک زمانے میں لنڈن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ لاہور میں آ کر انھوں نے تعلیم اور اصلاحِ معاشرت کا کام اپنے ذمے لیا اور اس غرض سے ایک انجمن کی بنا ڈالی جو "انجمن پنجاب" کے نام سے مشہور ہوئی۔ آزاد اس کی کارروائیوں میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے، چناں چہ ۱۸۶۷ء میں انھیں، اس کا سکرٹری نامزد کیا گیا۔ گارساں دتاسی اپنے ۱۸۶۸ء کے لکچر میں ان کی خدمات کا بالاستحسان ذکر کرتا ہے۔

۱۸۶۵ء میں آزاد کو مشرقی ترکستان کا سفر پیش آیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کچھ عرصے سے روس نے بخارا، خیوا اور فوقند میں اپنے جارحانہ اقدامات، بہت تیز کر دیے تھے، اور بعض علاقوں پر قابض بھی ہو گیا تھا۔ حکومتِ ہند کو یہ خدشہ تھا کہ روس کی یہ پیش قدمی کہیں ہندستان پر حملہ کی صورت نہ اختیار کر لے، لہٰذا اس کی پیش بندی کے لیے یہ فیصلہ ہوا کہ ضروری اطلاعات حاصل کرنے کے لیے ان ممالک میں ایک خفیہ مشن بھیجا جائے۔ اس کے سربراہ پنڈت من پھول اور آزاد ایک رکن تھے۔

اس سفر سے نہ صرف آزاد کی علمی اور ادبی معلومات میں اضافہ ہوا، جس سے انھوں نے اپنی تصنیف سخن دانِ فارس میں مدد لی، بل کہ حکومت کی نظروں میں ان کا وقار بھی بڑھ گیا۔ آزاد کی خواہش تھی کہ غدر کے عواقب سے انھیں نجات ملے اور اس خدمت کی وجہ سے یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے جاتا رہا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اُن دنوں پنجاب میں تعلیم جدید کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ نئی قسم کی درسی کتابیں، جو جدید ضروریات کی کفیل ہوں، ابھی تک نہیں لکھی گئی تھیں۔ چناں چہ یہ کام ملک کے اہلِ قلم کے سپرد ہوا۔ یہاں آزاد سب سے آگے رہے اور ان کی تصانیف ایک عرصۂ دراز تک داخلِ نصاب رہیں۔ ان درسی کتابوں میں قصصِ ہند کو ایک شاہ کار کا مقام حاصل ہے۔

یہ کتاب تاریخ ہند کے دورِ اسلامی کے منتخب واقعات پر مشتمل ہے۔ اس میں آزاد کا تخیل نہایت آب و تاب سے کام کرتا دکھائی دیتا ہے اور قاری محسوس کرتا ہے گویا وہ یہ تمام واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

مئی۱۸۷۴ء میں آزاد نے ایک باقاعدہ مشاعرے کے آغاز سے جدید شاعری کی تائید میں پہلا قدم اُٹھایا۔ دراصل یہ کام حکومت کے ایما پر ہوا تھا، لیکن آزاد بہ حیثیت سیکرٹری اس کے روحِ رواں تھے۔ ہماری رائے میں اس تحریک کو کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ پھر بھی جدید شاعری کی تاریخ میں اسے سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

نیرنگِ خیال کے علاوہ، جس کا بالتفصیل ذکر بعد میں آئے گا، آزاد کی شہرت کا انحصار دو تصانیف پر ہے؛ ایک آبِ حیات اور دوسری سخن دانِ فارس۔

آبِ حیات شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے، اس میں اُردو تنقید ایک ہی جست میں مغربی تنقید کے شانہ بہ شانہ کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی خوبی اور اہمیت کا صحیح اندازہ پرانے تذکروں سے اس کا مقابلہ کرنے پر ہوتا ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ بعض پرانے تذکرے عمدہ معلومات پر مشتمل ہیں، لیکن ان کا رنگ ادبی نہیں۔ خط و کتابت کے ذریعے نیا مواد حاصل کرنے کے علاوہ آزاد نے انھی تذکروں سے اپنا مواد حاصل کیا، لیکن ان پارہ ہائے سنگ و خشت سے اس نے ایک شان دار عمارت تیار کی ہے۔ آبِ حیات میں حرکت اور زندگی ہے، ابتدا ہی سے آزاد قاری کے مخیّلہ پر حاوی ہو جاتا ہے، اور دورانِ مطالعہ وہ یہ محسوس کرتا ہے گویا عہدِ سلف کی یہ یادگاریں ازسرِنو زندہ ہو کر اپنی پرانی سرگرمیوں کا اعادہ کر رہی ہیں۔

آبِ حیات ایک زندۂ جاوید تصنیف ہے۔ پچھلے ستر اسّی سال میں ہر وہ شخص، جس نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اس نے لامحالہ اس سے استفادہ کیا ہے اور ہر وہ نقاد جو آیندہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کرے گا، اُس کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری و لابدی ہوگا۔

سخن دانِ فارس کے دو حصے ہیں؛ پہلا حصہ دو لیکچروں پر مشتمل ہے، جن کا موضوع ہند ایرانی لسانیات ہے۔ دوسرا حصہ گیارہ لیکچروں پر مشتمل ہے۔ ان کا موضوع قدیم و جدید ایرانی تہذیب و معاشرت، سیاسی حالات، جغرافیائی معلومات اور علم و ادب ہے۔ آزاد نے جابجا اشارے کیے ہیں کہ یہ معلومات ان کے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں، لیکن چوں کہ وہ ایران ۱۸۸۵ء میں گئے تھے اور یہ لیکچر سفر ترکستان کے بعد دیے گئے تھے۔ اس لیے آزاد کا یہ قول محلِ نظر ہے۔ میری تحقیق کے مطابق آزاد نے جو کچھ ترکستان میں دیکھا اسے ایران پر منطبق کر دیا۔ علاوہ ازیں چھٹے اور ساتویں باب کے بیش تر حصے مالکم صاحب کی تاریخِ ایران (۱۸۰۰ء) کے غیر تسلیم کردہ تصرفات ہیں۔

آزاد کی ایک اور تصنیف دربارِ اکبری ہے جس میں شہنشاہ اکبر اور اس کے اہلِ دربار کے

حالات درج ہیں۔ آزاد مذہبی رواداری کے ہمیشہ مؤید رہے اور انھیں اکبر سے بدیں وجہ عقیدت تھی کہ اس نے سلطنت کی اساس ہندو مسلم اتحاد پر مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی۔ کتاب کا بہترین حصہ وہ ہے، جس میں دینِ الٰہی پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد نے ثابت کیا ہے کہ اکبر کا مذہبی اجتہاد (یا ارتداد) علمائے سو کی تنگ نظری، ریاکاری اور باہمی مناقشات کے خلاف ردِعمل تھا۔

آزاد کو ایرانی ادبیات سے والہانہ لگاؤ تھا اور انھیں سرزمینِ ایران کو دیکھنے کی مدت سے لگن تھی۔ یہ خواہش ۱۸۸۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ آزاد نے اپنے مشاہدات اور تاثرات کا سرسری ساذکر اپنے روز نامچے سیرِ ایران میں کیا ہے۔

سفرِ ایران کے بعد آزاد دیـــوانِ ذوق کی ترتیب میں منہمک رہے۔ یہ کام ختم ہوا ہی تھا کہ وہ ایک دماغی عارضے میں مبتلا ہو گئے اور تقریباً بیس سال تک عالمِ دیوانگی میں رہ کر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔

نیرنگ خیال جیسا کہ اس کے مندرجات سے واضح ہے، تیرہ تمثیلی مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے پہل اسے دو حصوں میں شائع کیا گیا تھا۔ حصۂ اوّل پہلے سات مضامین اور دوسرا حصہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا، اگرچہ اس کے مضامین اس سے کچھ عرصہ پہلے لکھے جا چکے تھے۔ دوسرا حصہ آزاد کی وفات کے تیرہ سال بعد ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ جیسا کہ پہلے حصے کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے، آزاد کا اس سلسلۂ مضامین کو جاری رکھنے کا ارادہ تھا اور اسے صرف عارضی طور پر ملتوی کیا گیا تھا۔

نیـــرنگ خیـــال 'مغرب کے نثری ادب سے اُردو داں طبقے کو رُوشناس کروانے کی پہلی باقاعدہ کوشش تھی۔ بقول آزاد، اب تک جو کچھ انھوں نے لکھا تھا، محض حکومت کے ایما سے لکھا تھا، نیرنگ خیال اُن کی ذاتی امنگ اور شوق کی پیداوار ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، نیـــرنگ خیـــال انیسویں صدی کے ربعِ ثالث کے بدلتے ہوئے ادبی ذوق کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس دَور میں ہمیں بیک وقت دو اثرات کام کرتے دکھائی دیتے ہیں؛ ایک مغربی اصناف و خیالات کا اثر و نفوذ اور دوسرے یہ احساس کہ قدیم ادب، کیا بلحاظ موضوعات اور کیا بلحاظ اسلوب، جدید ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔ ہماری نشاۃ ثانیہ کے یہی مثبت اور منفی پہلو ہیں اور "نیرنگ خیال" میں انھی رجحانات کی ترجمانی ہوئی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

> "تماشا گاہِ عالم میں جو اہلِ نظر ایک نگاہ سے میدانِ ماضی اور ایک سے حال و استقبال کی سیر کر رہے ہیں، انھیں صاف نظر آتا ہے کہ ہمارا ملک عن قریب آفرینشِ جدید کے وجود میں تبدیلی کیا چاہتا ہے، نئے نئے علوم، نئے نئے فنون

ہیں، سب کے حال نئے ہیں، ول دل کے خیال نئے ہیں، عمارتیں نئے نقشے کھینچ رہی ہیں، رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں۔ اس طلسمات کو دیکھ کر عقل حیران ہے، مگر اسی عالمِ حیرت میں ایک شاہ راہ پر نظر پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سولیزیشن (تہذیب) کی سواری، شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانے کو جھاڑ بہار رہا ہے اور جس حال میں ہے اس کے استقبال کو دوڑتا ہے۔"

اوپر کہا جا چکا ہے کہ اُس وقت عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قدیم اُردو ادب اور اس کے موضوعات ضروریاتِ حاضرہ کے کفیل نہیں ہو سکتے۔ یہاں مصلحین کے پیشِ نظر دو باتیں تھیں اور آزاد قصے اجمالاً دونوں کا ذکر کیا ہے؛ ایک تو یہ کہ نئی ذہنیت پرانی قسم کے فوق العادات قصے کہانیوں کو قبول کرنے میں پس و پیش کرتی تھی، وہ ادب میں افادیت کی قائل تھی، لہٰذا اُس وقت ایک ایسے اَدب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، جو نئی زندگی کی تعمیر و ترقی میں ممد و معاون ہو۔ آزاد لکھتے ہیں:

"اب وہ زمانہ نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطے مینا کی زبانی سنائیں۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں، یا پریاں اڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوا دیں۔ علوم و فنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں بھی ہونی چاہئیں، جو صاف شفاف تصویریں رسوم و اخلاق کی ہماری بزم کلام میں سجائیں۔ ان میں جو ہمارے داغ دھبے ہیں، سب نظر آئیں اور آب تاثیر سے دھوئے جائیں۔"

آزاد یہاں اصلاح معاشرت پر زور دیتے ہیں۔ اُن کی رائے میں اُسے اَدب میں مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے، لیکن نیرنگ خیال کے مضامین سے اس نظریے کی تائید نہیں ہوتی۔ اور اُن کی یہ فروگزاشت اور بھی عجیب معلوم ہوتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایڈیسن اور سٹیل نے، جن کے مضامین سے آزاد نے استفادہ کیا ہے، اصلاح معاشرت کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنایا ہوا تھا اور یہی ان کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ کتاب تصنیف ہوئی تو یہ سوال اٹھا کہ آزاد نے ان مضامین کا مواد کہاں سے حاصل کیا ہے؟ چوں کہ ان دنوں، اور اس کے بعد عرصہ دراز تک، یہی خیال عام تھا کہ آزاد انگریزی نہیں جانتے، لہٰذا قارئین کی رائے میں یہ مواد کسی انگریزی دان سے ان تک پہنچا تھا، اور چوں

کہ اُن دنوں، یا اس سے چند سال پہلے آزاد کے ڈاکٹر لائٹنر سے نہایت اچھے مراسم تھے، اس لیے یہ خیال قرینِ قیاس تھا کہ یہ مواد ڈاکٹر لائٹنر ہی نے بہم پہنچایا ہوگا۔ آزاد پر اپنے انگریزی لیکچر (۱۸۹۸ء) میں شیخ عبدالقادر اس نظریے کی تائید کرتے ہیں:

> ''جہاں تک میرا علم مدد کرتا ہے، ٹھیٹھ یونانی نمونے پر سب سے پہلے تمثیل لکھنے کا اعزاز آزاد ہی کو حاصل ہے۔ میں نے سنا ہے، اور غالباً یہ درست بھی ہے، کہ مصنف کو اس تصنیف کا خاکہ ڈاکٹر لائٹنر ہی سے ملا تھا، جو یونانی اور انگریزی اَدب کا ماہر تھا۔ اُس نے آزاد کو اپنی معلومات سے مستفید کیا اور اس نے اس کے مُہیا کردہ مواد سے نیرنگ خیال کی عمارت تعمیر کی۔''

۱۹۳۷ء میں، جب میں آزاد پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا، مجھے ''سیر زندگی'' پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ یہ مضمون اس سے پہلے بھی کہیں پڑھ چکا ہوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ایسا ہی ایک مضمون میں نے کہیں انگریزی میں بھی پڑھا ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ ایسے تمثیلی مضامین اٹھارویں صدی کے انگریزی اَدب میں عام تھے۔ چناں چہ تھوڑی سی جستجو کے بعد وہ مضمون جس کی مجھے تلاش تھی، مل گیا اور سیر زندگی سے اس کا مقابلہ کرنے پر میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ آزاد کا مضمون اسی انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔

اب مجھے خیال ہوا کہ ہو نہ ہو نیرنگ خیال کے باقی مضامین بھی اِسی دَور کے انگریزی مضامین سے لیے گئے ہیں۔ اس خیال کو مزید تقویت اس بات سے پہنچی کہ آزاد کے کئی ایک فقروں کی نحوی ساخت انگریزی فقروں سے ملتی جلتی تھی۔ چناں چہ جانسن، ایڈیسن، سٹیل وغیرہ کے مطالعے نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کتاب کے دیگر مضامین بھی انگریزی ہی سے ماخوذ ہیں۔

ذیل میں ان مضامین کی فہرست دی جاتی ہے، جن سے نیرنگ خیال کے مضامین ماخوذ ہیں:

An Allegorical History of Rest and Labour- Johnosn	آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہوا گیا۔
Truth, Falsehood and Fiction, an allegory'- Johnson.	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ
The Garden of Hope, a Dream, Johnson.	گلشن اُمید کی بہار

سیرِ زندگی The Voyage of Life,- Johnson.

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ The endeavour of Mankind to get rid of their burdens, a Dream'- Addison.

علوم کی بدنصیبی The conduct of patronage'- Johnson.

علمیت اور ذکاوت کے مقابلے An Allegory of Wkit and Learning'-Johnson.

جنت الحمقا Paradise of fools'- parnell, The Spectator, No.460.

خوش طبعی Addidon, The Spectator, No.35.

نکتہ چینی An Allegory of criticism'- Jhnoson.

مرقعِ خوش بیانی Addison, The Spectator, No.63.

سیرِ عدم Addison, The Spectator. No.501.

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار۔ Viscon of the Tables of Fame,' The Tatler, No.81.

اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ آزاد نے ان مضامین سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔ میں نے اس سوال کا بہ غور مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آزاد کے تمام مضامین کو ترجمہ کہنا ہی درست ہوگا۔ عام طور پر آزاد اصل متن سے تجاوز نہیں کرتے اور اس کا بامحاورہ یا آزاد ترجمہ کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں تصرفات اور اضافے بھی ملتے ہیں، لیکن ان کی نوعیت محض تشریحی یا توضیحی ہے، یا پھر زیبِ داستان کے

لیے برمحل تفاصیل کا اضافہ کر دیا گیا۔ صرف ایک مضمون یعنی "شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار" اصل مضمون سے صرف اس حد تک مختلف ہے کہ آزاد نے تمہید اور آخری اجزا کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزی مضمون کے مغربی مشاہیر کی جگہ مشرق کے نامور اشخاص کی مثالیں دی ہیں۔

ذیل میں آزاد کے مضامین اور ان کے مآخذ سے متوازی اقتباسات دیے جاتے ہیں تا کہ قاری بطور خود فیصلہ کرے کہ آزاد نے موخر الذکر سے کس حد تک استفادہ کیا ہے:

"In the early age of the world, as is well known to those who are versed in ancient traditions, when innocence was yet untainted, and simplicity unadulterated, mankind was happy in the enjoyment of continued pleasure, and constant plenty, under the protection of Rest ; a gentle divinity, who required of her worshippers neither altars nor sacrifices, and whose rites were only performed by prostrations upon turfs of flowers in shades of jasmine and myrtle, or by dances on the banks of rivers flowing with milk and nectar.

Under this easy government the first generation breathed the fragrance of perpetual spring, ate the fruits, which without culture, with the birds singing over their heads, and the beasts sporting about them. But by degrees they began to lose their original integrity. Each, though there was more than enough for all, was desirous of appropriating part to himself. Then entered violence and fraud, and theft and rapine. Soon after pride and envy broke into the world, and brought themselves rich when they wanted nothing, now rated their demands, not by the

calls of nature, but by the plenty of others ; and began to consider themselves as poor, when they beheld their own possessions exceeded by those of their neighbours. Now only one could be happy, because only one could have most, and that one was always in danger, lest the same arts by which he had supplanted other should be practised upon him."

آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا:

''سیر کرنے والے گلشنِ حال کے اور دُور بین لگانے والے ماضی وہ استقبال کے روایت کرتے ہیں کہ جب زمانے کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ تھا اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا، تو تمام اولادِ آدم مسرّتِ عام اور بے فکریٔ مدام کے عالم میں بسر کرتی تھی۔ ملک ملک فراغ تھا اور خسروِ آرام، رحم دل، فرشتہ مقام گویا اِن کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا، نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا۔ اُس کی اطاعت وفرماں برداری اسی میں ادا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گل زاروں میں گلگشت کرتے تھے، ہری ہری سبزے کی کیاریوں میں لوٹتے تھے، آبِ حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے۔ ہمیشہ وقت صبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا۔ نہ گرمی میں تہہ خانے سجانے پڑتے، نہ سردی میں آتش خانے روشن کرتے۔ قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں ایسی موافق پڑتی تھیں کہ جاڑے کی سختی یا ہوا کی گرمی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے، چلتے چشموں پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے، وہ شربت سے سوا مزہ، دودھ سے زیادہ قوت دیتے تھے، جسمانی طاقت، قوتِ ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے اُن کی اپنی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا کہ سیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کی پیداواریں، رنگارنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے۔ آب وہوا، قدرتی غذائیں تیار کر کے زمین کے دسترخوان پر چن دیتی تھی۔ وہ ہزار مقوی اور مفرح کھانوں کے کام

دیتی تھی۔ صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوؤں کے عطر مہک رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچہے، خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے۔ خُوب صورت خُوب صورت چرند پرند آس پاس کلیل کرتے پھرتے تھے۔ جابجا درختوں کے جھرمٹ تھے۔ اُنھی کے سایے میں سب چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش و آرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لیے کمی نہ ہوتی تھی اور کسی طرح ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا۔ سب کی طبیعتیں خوشی سے مالا مال اور دل فارغ البال تھے۔

اتفاقاً ایک میدان وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم مہک گیا، مگر بُو اس کی گرم اور تیز تھی۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں اور ہر ایک کے دل میں خود بہ خود یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ سامانِ عیش و آرام کا جو کچھ ہے، میرے ہی کام آئے، اور کے پاس نہ جائے۔ اس غرض سے اس گل زار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آ کر چالاکیاں دکھانے لگے پھر تو چند روز کے بعد کھلم کھلا ان کی ذریات یعنی غارت، تاراج، لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگے۔ جب راحت و آرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ غُرور، خود پسندی، حسد نے اس باغ میں آ کر قیام کر دیا۔ ان کے اثرِ صحبت سے یہ لوگ بہت خراب ہوئے، کیوں کہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ نہ لائے۔ پہلے تو خدائی کارخانے فارغ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بموجب کھلے ہوئے تھے، یعنی عیش وافر اور سامان فراواں، جو کچھ درکار ہو، موجود تھا اور اسی بے احتیاطی کو لوگ تو نگری کہتے تھے، پھر یہ سمجھنے لگے کہ اگر ہمارے پاس ہر شے ضرورت سے زیادہ ہو اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ ہو، لیکن تو نگر ہم جبھی ہوں گے جب کہ ہمسایہ ہمارا محتاج ہو۔ ہر چند اس بیچارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو، مگر اُنھیں جب ہمسائے جب خوش حال نظر آتے تھے تو جل جاتے تھے، اور اپنے تئیں محتاج خیال کرتے تھے۔"

"It is reported of the persians by an ancient writer that

the sum of their education consisted in teaching youth to ride, to shoot with the bow, and to speak truth.

The bow and the horse were easily mastered, but it would have been happy if we had been informed by what arts veracity was cultivated, and by what preservatives a persian mind was secured against the temptations to falsehood.

There are, indeed, in the present corruption of mankind, many incitements to forsake truth, the need of palliating our own faults, and the convenience of imposing on the ignorance or credulity of others, so frequently occus; so many Immediate evils are to be avoided, and so many present gratifications obtained, by craft and delusion, that very few of those who are much entangled in life, have spirit and constancy sufficient to support them in the steady practice open veracity,"

سچ اور جُھوٹ کا رزم نامہ:

''عہدِ قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے؛ شہ سواری، تیراندازی اور راست بازی۔ شہ سواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی، مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے، اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکر اُن کے دلوں پر شیشۂ جادُو مارتا تھا تو یہ اس چوٹ سے اس کی اَوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اِس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے۔ چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشتِ خاک کو اس دیوِ آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔

انسان سے اکثر ایسا جرم ہوتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے، ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی آبلہ فریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے، جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اِس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں، جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے رستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں"۔

"I was musing on this strange inclination which every man feels to deceive himself, and considering the advantages and dangers proceeding from this gay prospect of futurity, when, falling asleep, on a sudden. I found myself placed in a garden, of which my sight could descry no limits. Every scene about me was gay and gladsome, light with sunshine, and fragrant with perfumes; the ground was painted with all the variety of spring, and all the choir of nature was singing in the groves. When I had recovered from the first raptures, with which the confusion of pleasure had for a time entertained me, I began to take a particular and deliberate view of this delightful region. I then perceived that I had yet higher gratificatio

ns to expect, and that at a small distance from me, there were brighter flowers clearer fountains, and more lofty groves, where the birds, which I yet heard but faintly, were exerting all the power of melody. The trees about me were beautiful with verdure, and fragrant with blossoms; but I was tempted to leave them by the sight of ripe fruits, which

seemed to hang only to be plucked. I therefore walked hastily forwards, but found, as I proceeded, that the colours of the field faded at my approch, the fruit fell before I reached it, the birds flew still singing before me, and though I pressed onward with great celerity, I was still in sight of pleasures of which I could not yet gain the possession, and which seemed to mock my diligence, and to retire as I advanced."

گلشنِ اُمید کی بہار:

"میں ایک رات انھی خیالات میں حیران تھا، اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکا دیتا ہے، اور زمانہ آیندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لیے امید و بیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے؟ یکا یک آنکھ لگ گئی، و یکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نو بہار میں ہوں، جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے، تمام عالم رنگین و شاداب ہے۔ ہر چمن رنگ رُوپ کی دُھوپ سے چمکتا، خوش بُو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصلِ بہار کی طرح گُل ہائے گوناگوں سے بُوقلموں ہو رہی ہے اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتاپا محو ہو گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دل کشا کو نظرِ غور سے دیکھنے لگا، اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو۔

پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے چکیلے پھول کھلے ہیں، آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت

جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے، یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوش بو سے مہک پھیلاتے ہیں، مگر پھر یہاں سے جو نظر اٹھائی تو اور ہی طلسمات نظر آیا؛ یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جُھوم رہے ہیں ان کے تیار میوے زمین کو چُوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا، چناں چہ قدم اٹھایا، مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا زیادہ حیران ہوتا گیا، کیوں کہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی، پاس پہنچ کر اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی، اور میوے تو گر ہی چکے تھے، بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھین، وہ آگے آگے اڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگر چہ میں بہت پُھرتی سے پہنچا تھا اور جو بہاریں تھیں وہ ہر ہر قدم پر سامنے ہی تھیں، مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں۔ گویا میرے شوقِ آرزو کو ڈھکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔"

"life," says Seneca, "is a voyage in the progress of which we are perpetually changing our scenes: we first leave childhood behind us, then youth, then the years of ripened manhood, then the better and more pleasing part of old age,"The perusal of this passage having excited in me a train of reflections on the state of man, The me incessant fluctuation of his wishes, the gradual change of his disposition to all external objects, and the thouglessness with which he floats along the stream of time, I sunk into a slumber amidst my meditations, and on a sudden, found my ears filled with the tumult of labour, the shouts of alacrity, the shrieks of alarm, the whistles of wind

and the dash of waters.

My astonishment for a time repressed my curiosity; but soon recovering myself so far as to inquire wither we were going, and what were the cause of such clamour and confusion. I was told that we were launching into the ocean of life, that we had already passed the straits of infansy, in which multitudes had perished, some by the weakness and fragility of their vessels and more by the folly, perverseness, or negligence of those who undertook to steer them; and that we were now on the main sea, abandoned to the winds and billows, without any other means of securitly than the care of pilot, whom it was always in our power to choose among great number that offered thire direction and assistance."

سیرِ زندگی:

"ایک حکیم کا قول ہے کہ "زندگی ایک میلہ ہے، اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں، یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے آگے بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے،" جب اس فقرے پر غور کیا اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصور کیا تو مجھے انواع واقسام کے خیالات گزرے۔ اوّل تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم اونا ادنا چیز کا محتاج ہے۔ پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلب گار ہوتا ہے، ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے، اور جو اس کے برخلاف ہے، اس کا عاشقِ زار ہوتا ہے۔

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیرتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب

خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتاً درد و مصیبت کی فریاد، خوشی کے دلولے، ڈر کی چیخیں، ہواؤں کے زور، پانی کے شور، ایسے اٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا۔ اژل تو دل بہت حیران ہوا، بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں، اور اس عمل کا کیا سبب ہے؟ ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب! کہاں جاتے ہیں، دریائے حیات میں تیر رہے ہیں۔ پہلے تو لڑکپن کی بہر تھی کہ جس میں کشتیوں کی کمزوری سے، کچھ ملاحوں کی غفلت سے، کچھ ان کی بے وقوفی سے، لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے، وہ نہر تو ہم اُتر آئے ہیں، اب مانجھا ر سمندر ہے اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے، کبھی گرداب ہے، کبھی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کیے ہیں، جو رستہ بتانے اور پار اتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے ہیں، مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش آتی ہے، نہ ملاح کی، فقط خدا کی آس ہے اور بس۔

"It is a celebrated thought of Socrates, that if all the misfortunes of mankind were cast into a public stock, in order to be equally distributed among the whole species, those who now think themselves the most unhappy, would prefer the share they are already possessed of before that which would fall to them by such a division. Horace has carried this thought a great deal further in the motto of my paper, which implies, that the hardships or misfortunes we lie under are more easy to us than those of any other person would be, in case we could change condition with him.

As I was ruminating upon these two remarks, and seated in my elbow chair, I insensibly fell asleep, when on a sudden, methought, there was a proclamation made by jupiter, that every mortal should bring his griefs and calamities, and throw them together in a heap. there was a large plain appointed for this purpose. I took my stand in the cemtre of it, and saw with a great deal of pleasure the whole human species marching one after another, and throwing their several loads, which immediately grew up into a prodigious mountain, that seemed to rise above the clouds."

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا:

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں، تو جو لوگ اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو غنیمت سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطانِ افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چناں چہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے، لیکن

جو بوجھ گرتا ہے، مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

"The sciences having long seen their votaries labouring for the benefit of mankind without reward, put up their petition to jupiter.For a more equitable distribution of riches and honours. jupiter was moved at their complaints, and touched with the approaching miseries of men whom the Sciences, wearied with perpetual ingratidude, were now threatening to for sake, and who would have been reduced by their departure, to feed in dens upon the mast od trees, to hunt their prey in deserts, and to perish under the paws of animals stronger and fiercer than themselves.

A synod of the celestials was therefore convened, in which it was resolved, that patronage should descend to the assistance of Sciences. patronage was the daughter of Astrea, by a mortal father, and had been educated in the School of Truth, by the goddiss, whom she was now appointed to protect. She had frome her mother that dignity of aspect, which struck terror into false merit, and from her mistress that reserve, which made her only accessible to those whom the Sciences brought into her presence.

She came down with the general acclamation of all the powers that favour learning. Hope danced before her, and liberality stood at her side, ready to scatter by her direction the gifts which Fortune, who followed her, was commanded

to supply. As she advanced towards parnassus, the clouds, which had long hung over it, were immediately dispelled. The shades, before withered with drought, spread their original verdure, and invigorated their scents: the Muses tuned their harps and exerted their voices; and all the concert of nature welcomed the arrival."

علوم کی بدنصیبی:

علوم وفنون نے دیکھا کہ مدت گزر گئی، ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادتِ دلی سے انسان کے فائدوں کے لیے محنت کر رہے ہیں اور جس صدقِ دل سے جانفشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں، اس کا صلہ کچھ نہیں ملتا۔ بل کہ جن بے لیاقتوں کو جوہرِ کمال سے کچھ واسطہ نہیں، اور انسان کی نفع رسانی کی کچھ بھی پرواہ نہیں رکھتے، وہ کام یابی اور عیش وعشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں۔ سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطانِ آسمانی کے دربار میں عرض کی؛ خلاصہ جس کا یہ کہ ''انصاف وعدالت کے بموجب تمام مریدانِ خدمت گزار کو بمقتضاے انصاف عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں''۔ دربار میں مشتری صدر اعلا تھا اور عطارد میر منشی۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور اداے خدمت میں مشقتیں تھیں، سب جتائی اور دکھائی گئیں اور حق تلفیوں کا دعویٰ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت عالمِ خاک میں علوم وفنون کی کوششوں اور کارگزاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہو گئے ہیں کہ یقین ہے چند روز میں دنیا کو چھوڑ کر عالمِ بالا کی طرف چلے آئیں، اور اگر وہ دنیا میں نہ رہے تو حضرتِ انسان، جنھوں نے یہ شوکت وشان بنائی ہے، حیوانوں سے بدتر رہ جائیں گے۔ پھل پھلاری، گھاس پات چرتے پھریں گے، جنگلوں کے جانور بن جائیں گے، اور جوان سے زیادہ وحشی ہوں گے وہ انھیں پھاڑ کھائیں گے۔ اس کے فیصلے کے لیے عالمِ بالا میں کمیٹی ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو

اراکینِ دربار کا رنگ ہوتا ہے وہی کل دربار کا رنگ ہوتا ہے۔ چناں چہ سب کا اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہیے۔

ملکہ کوکب جمال کی ایک بیٹی تھی کہ باپ اس کا عالمِ خاکی سے تھا، مگر اس کے نورِ جمال اور حسنِ کمال نے تمام عالمِ بالا کو روشن کر رکھا تھا، اور صداقت اور حقیقت کے رستے تعلیم پائی تھی۔ اسے حضور سے ملکۂ علم افروز کا خطاب عطا ہوا اور عقل کا تاج سر پر رکھا گیا، جس میں آفتاب کی طرح فہم اور اک کی شعائیں جگمگاتی تھیں۔ رفعت کا تخت پھولوں سے سجایا، اس ملکۂ موصوفہ کو جلوہ گر کر کے اس طرف روانہ کیا۔ آسمان کے تارے اُتارے اور زمین نے بجائے غبار نور اڑایا۔ اس نے بھی عالم میں آ کر باپ کی طرف سے وہ شان وشوکت، لیاقت دکھائی جس سے تمام بے لیاقت تھرا گئے اور ماں کی طرف سے وہ روشنی پھیلائی کہ کرۂ خاک، نور کی قندیل ہو گیا۔

"Wit and learning were the children of Apollo, by different mothers: Wit was the offspring of Eurphrosyne, and resembled her in cheerfulness and viracity: learning was born of Sophia, and retained her seriousness and caution. As their mothers were rivals, they were bred up by them from their birth in habitual opposition, and all means were so incessantly employed to impress upon them a hatred and contempt of each other, that thought Apollo, who foresaw the ill effects of their discord, endeavoured to soften them, dividing his regard equally between them, yet his impartiality and kindness were without effect; the maternal animosity was deeply rooted, having been intermingled with their first ideas, and was confirmed every hour, as fresh opportunities occurred of exerting it. No

sooner were they of age to be received into the apartments of other celestials, than Wit began to entertain venus at her toilet, by aping the solemnity of learning, and learning to divert Minerva at her loom, by exposing the blunders and ignorance of Wit."

علمیّت اور ذکاوت کے مقابلے:

کہتے ہیں کہ اقلیمِ خیال میں ایک وسیع ولایت تھی کہ جس کا نام ملک فصاحت اور وہاں کے بادشاہ کا لقب ملک الکلام تھا۔ بادشاہِ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں؛ ایک کا نام فرحت بانو اور دوسری کا نام دانش خاتون تھا۔ دانش خاتون کا ایک بیٹا تھا، یہ سیدھا سادا شخص حسنِ متانت میں باپ کا خلف الرشید اور تمکنت اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا۔ اسے علم کہتے ہیں۔ فرحت بانو کی بیٹی ذکاوت تھی کہ باپ کے سبب سے خوش بیانی میں اسمِ مسمّیٰ اور ماں کے اثر سے زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختے کو شرمندہ کرتی تھی۔ چوں کہ فرحت بانو اور دانش خاتون دونوں سوکنیں تھیں، دونوں بچوں نے بگاڑ کا دودھ پیا اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی، یعنی ابتدا سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں کہ ایک کو ایک خاطر میں نہ لاتا تھا، بل کہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھا۔ باپ نے دیدۂ دور اندیش سے ان کی نااتفاقی کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لیے تھے۔ اس لیے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنائیت کی گرمی محبت سے ملائم ہوں۔ آخر صورت یہ نکالی کہ اپنی نظرِ محبت کو دونوں میں تقسیم کر دیا، مگر باپ کی شفقتِ منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا، کیوں کہ ماؤں کی طرف کی عداوت دور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی، اور بچپنے کے خیالات کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ بہت دُور تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ نئے نئے موقعے جو پیش آتے تھے، ان میں عداوت مذکور اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی، مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں کے دونوں خوبی و کمال کی جان اور تعلیم و تہذیب کے پتلے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو عالمِ بالا کے پاک نہادوں کی نظر ان پر پڑنے لگی اور وہاں

مہمانیوں میں آنے جانے لگے۔ چند روز کے بعد ذکاوت نے باپ کے اشارے سے اپنے نشاط محل میں بڑے بڑے اہلِ کمال کو جمع کر کے رقاصہ فلک، یعنی زہرہ، کی ضیافتیں کرنی شروع کیں، مگر ان جلسوں میں علم کا سانگ بھرا اور اس میں اس خوبی سے اس کی ہجو کی کہ محفل کو لٹا لٹا دیا۔ علم نے بہت برا مانا۔ چناں چہ اس کے توڑ پر قاضی افلاک یعنی مشتری کی ضیافت کی اور اپنے زورِ علم سے شہزادی ذکاوت کی بے اصل سخن سازی اور بے علم طرازیوں کی قلعی کھولنی شروع کر دی۔

"There are two kinds of immortality; that which the soul really engoys after this life, and that imaginary existence by which men live in their fame and reputation. The best and the greatest actions have proceeded from the prospect of the one or the other of these; but my design is to treat only of those who have chiefly proposed to themselves the latter, as the principal reward of their labours. It was for this reason that I excluded from my Tablets of Fame all the great founders and votaries of religion; and it is for this reason also, that I am more than ordinary anxious to do justice to the persons of whom I am now going to speak; for, fame was the only end of all their enterprises and studies, a man cannot be too scrupulous in allotting them their due propection of it. It was this consideration which made me call the whole body of the learned to my assistance; to many leaned of whom I must own my obligations for the categories of illustrious persons, which they have sent me in upon this occasion. I yesterday employed the whole afternoon in comparing them with

each other; which made so strong an impression upon my imagination, that they broke my sleep for the first part of the following night, and at lenght therw me into a very agreeable vision, which I shall beg leave to describe in all its particulars."

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار:

بقائے دوام دو طرح کی ہے؛ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ کے لیے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرتِ دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے، یا ثواب آخرت کے لیے یا دنیا کی نام وری اور شہرت کے لیے ہوئے، لیکن میں اس دربار میں انھیں لوگوں کو لاؤں گا، جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور نام وری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں، مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں، ان کی حق تلفی نہ ہو جائے، کیوں کہ جن بے چاروں نے ساری جانفشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا، ان کے حصے میں کسی قسم کا نقصان ڈالنا سخت ستم ہے۔ اس لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چناں چہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں کہ انھوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر مجھے عنایت کی، اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلے میں گزری۔ نام ورانِ موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چوں کہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں، اس لیے عرض کرتا ہوں۔

"Our defects aud follies are too often unknow to us;nay they are so far from being knwn to us, that they pass for

demonstrations of our worth. This makes us easy in the midst of them, fond to show them, and to be esteemed for them. Then it is that a thousand unaccountable conceits, gay inventions, and extravagant actions, must afford us pleasures, and display us to other in colours which we ourselves take a fancy to glory in. Indeed is something so amusing for the time in this state of vanity and ill - grounded satisfaction, that even the wiser world has chosen an exalted word to describe its enchantments, and called it, 'The paradise of Fools."

Methought I was transported to a hill, green, flowery, and of an easy ascent. Upon the broad top of it resided squint - eyed Error, and popular Opinion with many heads; two that dwelt in sorcery, and were famous for bewitching people with the love of themselves. To these repaired a multitude from every side, by two different paths which leads towards each of them. Some who had the most amusing air went directly themselves to Error, without expecting a conductor; other of a softer nature went first to popular Opinion, from whence as she influenced and engaged them with their own praises, she delivered them over to his government."

جنت الحمقا:

دنیا میں اکثر قباحتیں اور حماقتیں ایسی ہیں کہ ہم سب ان میں آلودہ ہیں مگر معلوم نہیں ہوتیں۔ درحقیقت وہ ہماری رسائی فہم سے بہت اونچے طاق پر رکھی ہیں،

اور کچھ ایسے ڈھب سے سجائی گئی ہیں کہ ہر بدی عین خوبی نظر آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ آلودگی ہمیں کچھ بری بھی نہیں معلوم ہوتی، بَل کہ بجائے اس کے رفع کرنے یا چھپانے کے خود دکھاتے ہیں اور آرزوئیں کرتے ہیں کہ اپنی قباحتوں میں ترقیاں کریں اور اُنھی میں ہماری قدردانیاں ہوں۔ چناں چہ سینکڑوں واہیات، ہزاروں لغو خیالات، نئے مسخرہ پن، ظرافتوں کے چمن ہیں کہ وہی ہماری تفریح طبع اور خوش دلی کا سرمایہ ہو رہے ہیں، اور یہ رنگینیاں ہمیں ایسے ایسے رنگوں میں رنگین کر کے ابنائے جنس کے سامنے جلوہ دیتی ہیں کہ ہم بھی اُنھی میں خلعتِ افتخار لیتے ہیں۔ اس فخرِ بے ہودہ اور خیالِ بے بنیاد کی خوشی میں خدا جانے کیا لطف دیکھا ہے کہ سیانے دنیاداروں نے اس کی دل فریبیوں کا اشارہ کرنے کے لیے ایک لطیف اصطلاح چھانٹی ہے، یعنی ''جنت الحمقا''۔

.....ابھی سوتے سوتے معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے، مگر عجیب پہاڑ ہے کہ سبزے سے لہلہاتا، پھولوں سے چہچہاتا، جا بجا پانی لہراتا ہے۔ چڑھائی اس کی ہمتِ بلند کا نمونہ ہے، مگر باوجود اس کے اعتدال پر ہے کہ دم نہیں چڑھنے دیتی، بَل کہ ساعت بہ ساعت سینے کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اتنے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو میدان فراخ پایا، اور دُور سے نظر آیا کہ ایک جگہ آبِ رواں میں پاؤں لٹکائے کوئی شہزادی بیٹھی ہے کہ زیور اور لباس سے طاؤس مرصّع کا عالم ہے مگر آنکھ سے بھینگی ہے اور اس بھینگی آنکھ پر ایک رنگین عینک بھی لگائے ہے کہ اسی سبب سے اسے کوئی شے حالتِ اصل پر نظر نہیں آتی۔ چناں چہ معلوم ہوا کہ ملکۂ غلط فہمی یہی ہے اور کل اہلِ عالم کی غلط فہمی گویا اسی کی نگاہ پر منحصر ہے۔

"It is indeed much easier to describe what is not humour, than what is; and very difficult to define it otherwise than as Cowley has done wit, by negatives. Were I to give my own notions of it, I would deliver them after Plato's manner, in a kind of allegory, and by

supposing Humour to be a person, deduce to him all his qualifications, according to the following genealogy. Truth was the founder of the family, and the father of Good Sense. Good Sense was the father of wit, who married a lady of collateral line called Mirth, by whom he had issue Humour. Hunour therefore beging the youngest of this illustrious family and descended from parents of such different desposition, is very various and unequal in his temper; sometimes you see him putting on grave looks and a solemn habit, sometimes airy in his behaviour and fantastic in his dress; insomuch that at different times he appears as serious as a judge, and as jocular as a Merry - Andrew. But as he has a great deal of the mother in his constitution, Whatever mood he is in, he never fails to make the company laugh.

But since there is an impostor abroad, who takes uopon the name of this young gentleman and would willingly pass for him in the world, to the end that well . meaning persons may not be imposed upon by cheats, I would desire, whan my readers when they meet with this pretender, to look into his parentage, and to examine him strictly, whether or not he be remotely allied to Truth, and lineally descended from Good Sense; if not they may conclude him a counterfeit."

خوش طبعی:

"خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شے ہے، البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں ہے۔ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں تو افلاطون حکیم الٰہی کی طرح کنایے اور استعارے سے بیان کروں، اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اس سے وہ صفتیں منسوب کروں جو کہ نسب نامۂ مندرجہ ذیل میں درج ہیں۔ یہ واضح ہو کہ سچ، خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے۔ اس گھرانے میں حسنِ ادب ایک نہایت معقول شخص تھا۔ اس کا بیٹا حسنِ بیان ہوا۔ اس نے اپنے ایک برابر کے خاندان میں شادی کی۔ اس کی دلھن کا نام خندہ جبیں تھا کہ آٹھ پہر ہنستی ہی رہتی تھی، چناں چہ اس کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے۔

چوں کہ خوش طبع سارے خاندان کا لب لباب تھا۔ اس لیے اس کی طبیعت بوقلموں اور گوناگوں تھی۔ کبھی تو نہایت سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا تھا اور کبھی رنگین بانکا بن جاتا تھا۔ کبھی ایسا بن کر نکلتا گویا قاضی القضاۃ یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں اور کبھی ایسے مسخرے بن جاتے کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھاتے۔ لیکن چوں کہ ماں کے دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے، اس لیے کسی حالت میں وہ اہل محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس کے ہمسائے میں ایک مکر باز، جعل ساز بھی رہتا تھا کہ اس نے بھی خوش طبع اپنا نام رکھ لیا تھا اور لوگ بھی اس بدذات کو اسی کا قائم مقام سمجھتے تھے۔ پس اس خیال سے کہ نیک مرد، ناواقف اس کے دھوکے میں نہ آئیں، میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اگر کبھی ایسے شخص سے ملیں تو اس کی اصل نسل کو اچھی طرح سمجھ لیں، اور غور سے دیکھیں کہ دور نزدیک کچھ رشتہ اس کا سچ کے قبیلے سے جا ملتا ہے یا نہیں۔ وہ حسن ادب کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے یا کسی اور سے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہی جعل ساز، بہروپیا سمجھیں۔"

"Criticism from whom they derive their claim to decide the fate of writers, was the eldest daughter of Labour and

Truth; she was, at her birth committed to the care of justice, and brought up by her in the palace of Wisdom. Being soon distinguished by the celestials, hor her uncommon qualities, she was appointed the governess of Fancy, and empowered to best time by the chorus of the Muses, when they Sung before the throne of jupiter.

When the Muses condescended to visit this lower world, they came accompanied by Criticism to whom, upon her descent from her native regions, jupiter gave a sceptre, to be carried aloft in her right hand, one end of which was tinctured with ambrosia and inwreathed with a golden foliage of amaranthus and bays; the other end was encircled with cypress and poppies, and dipped in the waters of oblivion. In her left hand she bore an unextinguishable torch, manufactured by labour and lighted by Truth of which it was the particular quality immediately to show every thing in its true form, however it may be disguised to common eyes. Whatever Art could complicate or Folly could cnfound was upon the first gleam of the torch of Truth, exhibited in its distinct parts and original simplicity: it darted through the labyrinths of sophistry, and showed at once all the absurdities to which they served for refuge; it pierced through the rodes which rhetoric often sold to falsehooed, and detected the disproportions of parts which artificial veils had been contrived to cover."

نکتہ چینی:

''حقیقتِ حال یہ ہے کہ نکتہ چینی، جس کی بدولت ان لوگوں نے مصنفوں کی قسمت کے فیصلے کرنے کا اختیار پایا ہے، اصل میں خواجہ حق پرست اور محنت خاتون کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو پرورش کے لیے انصاف کے سپرد ہوئی۔ چناں چہ اس نے دانش کے محلوں میں پال کر تربیت کیا۔ وہاں دن رات علوم کی جواہر کاری اور فنون کی مرصع نگاری کو دیکھا کرتی اور صبح و شام عقل آرائی کے باغوں میں جی بہلایا کرتی۔ جب بڑی ہوئی تو عالم بالا کے بزرگوں نے اسے حُسنِ کمال اور کمال حُسن میں بے مثال دیکھ کر ملک خیال کا تاج سر پر رکھ دیا کہ چند روز کے بعد مملکت خیال کی ملکہ ہو کر عالمِ بالا کی پریوں میں داخل ہوگئی۔ وہاں کی پریاں موسیقی، ناچ رنگ، سانگ، شاعری، افسانہ، تاریخ وغیرہ اپنے اپنے فن کی مالک تھیں چوں کہ انھیں بھی ملکِ خیال سے تعلق تھا، اس لیے ملکۂ نکتہ چینی نے ان کے کلام میں دخل پیدا کر لیا۔ جب اُنھوں نے عالمِ خاک کی طرف نزول کیا تو ملکۂ نکتہ چینی کہ خود فرماں روائے ملک خیال تھی، وہ بھی اُن کے ساتھ روئے زمین پر آئی۔ محل سے چلتے وقت انصاف یعنی اس کے استاد نے ایک پھولوں کی چھڑی دی تھی کہ اسے تمغۂ شاہی کی طرح ہر وقت اپنے داہنے ہاتھ میں رکھا کرے۔ عالمِ بالا کے دربار میں دستور تھا کہ جس رات کوئی پری اکھاڑا جماتا کرتی تو اس کی مبارک باد میں اُسے ایک ہار ملا کرتا تھا جس میں گلہائے جنت کی کلیاں اور امرت کے درخت کی کونپلیں پروئی ہوتیں۔ چناں چہ عصائے مذکور کے ایک سرے پر وہی ہار اور طرّے سجا کر انھیں آبِ حیات کے چشمے سے شاداب کیا جاتا اور دوسرے میں سرو بے ثمر کی پتیاں اور پوست کے ڈوڈے باندھ دیے جاتے۔ یہ دریائے محویت کے پانی میں ڈوبی ہوتی تھی، جس سے افیون کا گھولا اور پوست کا پانی ٹپکتا تھا۔ ملکۂ موصوف کے بائیں ہاتھ پر ایک مشعل بھی تھی کہ اُس کی روشنی کبھی بجھتی نہ تھی۔ اس مشعل کو خود محنت خاتون نے بنایا تھا اور حق پرست نے روشن کیا تھا۔ بڑا جوہر اس میں یہ تھا کہ چیز کیسی ہی مخفی ہو، اس کی روشنی سارا حال جوں کا توں آئینہ کر دیتی تھی، ملکۂ

ہنر کی الجھاوٹ اور حمق کی خرابی کام کو کیسا ہی درہم برہم کر کے الجھاوے، مشعلِ حق کی روشنی پڑتے ہی اس کی سدھاوٹ کا بال بال روشن ہو جاتا تھا۔ ظاہر آرائی اور غلط نمائی کے پیچوں میں اس کی شعاع سوئی کی طرح بیٹھ جاتی تھی اور جن جن اینچ پیچ میں ان کے لغویات پیچیدہ تھے، انھیں دفعتاً کھول دیتی تھی۔ بہت سے زرق برق لباس کہ خصامت اور عبارت آرائی نے جھوٹ کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، یہ اُن کے بھی بخیے کھول دیتی اور گھٹت بڑھت کی پُتلیاں جو بناوٹ کے کپڑے پہن کر ٹھیک ٹھاک بن بیٹھتی تھیں، اُنھیں بھی جھٹ پکڑ لیتی تھی۔"

"I must here inform my reader that the frontiers of the enchanted region, which I nave before described, were infabited by the species of Mixed Wit, who made a very odd appearance when they were mustered together in an army. There were men whose bodies were stuck full of darts, and women whose eyes were burning-glasses; men that had hearts of fire, and women that had breasts of snow. It would be endless to describe several monstersnof the like nature, that composed this great army, which immediately fell asunder, and divided itself into two parts, the one half throwing themselves behind the banner of Truth, and the other behind those of Falsehood.

The goddes of Falsehood was of a gigantic stature. and advanced some paces before the front of her army; but as the dazzling light which flowed from Truth began to shine upon her, she faded insensibly; insomuch that in a little space she looked rather like a huge phantom than a real substance. At length as the goddess of Truth

approached still nearer to her she fell away entirely, and vanished amidst the brightness of her presence so that there did not remain the least trace or impression of her figure in the place where she had been seen.

As at the rising of the sun the constellations grow thin, and the stars go out one after another, till the whole hemisphere is extinguished; such was the vanishing of the goddess; and not only of the goddess herself but of the whole army that attended her, which sympathised with their leader, and shrunk into nothing, in proportion as their goddess disappeared."

مرقع خُوش بیانی:

"شائقینِ سخن ذرا اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ سرحدی ملک خُوش بیانی مرکب کے فرقہ ہائے مختلف سے آباد تھا۔ یعنی کچھ اصل کچھ بداصل۔ چناں چہ ان کی فوج کی عجیب شان تھی۔ مردوں کے جسموں پر پرچھیاں چھپی ہوئی تھیں، عورتوں کی آنکھوں کی جگہ آتشی شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر مردوں کے دل انگارے تھے تو عورتوں کی چھاتیاں برف کی تھی۔ غرض کہ جیسے عجائب وغرائب مخلوقات سے یہ لشکر آراستہ تھا، اس حالت کی رنگا رنگی یہاں کے احاطے میں محصور نہیں ہوسکتی۔ چناں چہ جس وقت حریف کا نشان نمودار ہوا، دفعتاً ان میں ایک ہل چل مچی اور فوراً دو حصے ہوکر، ایک حصہ سچ کے سایۂ علم میں جا کھڑا ہوا، دوسرا اوت مہا بھوت یعنی جھوٹے دیوتا کے نشان کے نیچے ہوگیا۔ دیو دروغ اپنا کالا پہاڑ سا ڈیل ڈول لیے چند قدم آگے بڑھا، مگر جونہی سچ کی روشنی اس پر پڑنی شروع ہوئی وہ اس طرح بے معلوم تحلیل ہونا شروع ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں اصل جسم کی جگہ فقط ایک پرچھائیں سا نظر آنے لگا۔ آخر ادھر سے سچ بھی آگے بڑھا، جب اس کی روشنی پاس آئی تو وہ دیو دسیاہ بالکل نیست ونابود ہوگیا۔

تم نے آفتاب کو دیکھا ہوگا کہ جوں جوں نکلتا آتا ہے، جھوٹے موٹے تارے برابر چھپتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا نقشِ وجود سامنے کے نصف کرے سے بالکل محو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں معلوم ہوا کہ دیو دروغ یعنی اوت مہا بھوت تو بالکل نیست و نابود ہو گئے اور نہ فقط دیو دروغ بَل کہ سارا لشکرِ شیطان جو ہم دردی اور جاں نثاری کو حاضر تھا، دم میں ہوا ہوا گیا۔

برابر اس کے ایک اور عجوبۂ روزگار نظر آئی کہ اس کے بے انتہا سر ہیں اور دھڑ ایک۔ جس بات کی پسند اور ناپسند پر سر ہلاتی ہے، تمام جہان کے سر اسی طرح ہل جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پسندِ عام اسی کا نام ہے۔ ان میں سے ایک غلط نمائی کرتی ہے اور دوسری دل ربائی کر کے جس شے پر چاہتی ہے سب کو شیفتہ و فریفتہ کر لیتی ہے یہ دونوں رات دن جادوگری میں مصروف ہیں اور تسخیرِ خلائق کے عمل میں شہرۂ آفاق ہو گئی ہیں۔

لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ چاروں طرف سے انبوہ در انبوہ اُمڈے چلے آتے ہیں، ا ور اگرچہ آمد کے رستے دو ہیں، مگر ہر رستہ انھی دونوں کی طرف جاتا ہے۔ آنے والوں میں بعض آدمی جو خود آرائی کے رنگ سے رخ چمکائے ہوئے اور زیبائی کے روغن سے سر چکنائے ہوئے تھے، اُنھیں کچھ ہدایت یا اشارات کی حاجت نہ تھی۔ خود بخود غلط فہمی کی طرف چلے جاتے تھے اور وہ عالمِ فریب ایک ایک شخص کو اس کی طبیعت کے موافق اس طرح لبھاتی کہ لٹو ہو جاتا تھا۔ بعد ازاں کچھ ایسی کل مروڑتی کہ خود پسندِ عام کے پھندے میں جا کر گلا رکھ دیتا۔''

"How we are tortured with the absence of what we covet to possess, when it appears to be lost to us! What excursions does the soul make in imagination after it! and how does it turn into itself again, more foolistly fond and dejected at the disappointment. Our grief, instead of having recourese to reason, which might restrain it, searches to find a further nourishment. It calls upon memory to relate

the severs passages and circumstances of satisfaction which we formerly enjoyed; the pleasures we purchased by those riches that ars taken from us; or the power and splendour of our departed honours; or the voice, the words, the looks, the temper, and affections of our friends that are deceased, It needs must happen from hence that the passion should often swell to such a size as to burst the heart which contains it, if time did not make these circumstances less strong and lively, so that reason should become a more equal match for the passion, or if another desire which becomes more present did not overpower them with a livelier representation. These are thought which I had when I fell in to a kind of vision'...... I found myself upon a naked shore, with company whose afflicted countenances witenessed their conditions. Before us flowed water, deep, silent, and called the River of Tears, which issuing from two fountains on an upper ground, encompassed an island that lay beforeus. The boat which plied it was old and shattered, having been sonetimes overset by the impatience and haste of single passengers to arrive at the other side. This immediately was brought to us by Misfortune who steers it, and were all preparing to take our places, when there appeared a woman of a mild and composed behaviour, who began to deter us from it, by representing the dangers which would attend our voyage.

Hereupon some who knew her for patience, and some of those who too until then cried the loudest, were persuaded by her, and returned back."

سیرِ علوم:

"جب کوئی نہایت چاہیتی چیز ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور معلوم ہو کہ اب ہاتھ نہ آئے گی، تو کیسا دل بے قرار ہوتا ہے۔ جان صحرائے تصور میں کبھی اس کے پیچھے بھٹکتی پھرتی ہے، مگر جب تھک ہار کر ناچار ہو جاتی ہے تو اداس بے آس ہو کر آتی ہے اور اپنے ٹھکانے پر گر پڑتی ہے۔ عقل و فہم البتہ دلِ غمگین کو سہارا دے سکتے ہیں، مگر دل ایسا بھولا بھالا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا اور جو غذا اس کے جی کو بھاتی ہے، اسی کو ڈھونڈتا ہے۔ درحقیقت یاد، جو دل کی ہمسائی ہے وہ ہمیشہ غم کو خانۂ دل میں بلاتی ہے، اور ایامِ گزشتہ میں جو مزے اُٹھائے ہیں، یا دولت کھو کر عیش اڑائے ہیں ان کی گزری ہوئی بہاروں کے افسانے سناتی ہے۔ کسی کو اس دولت و عظمت کا غبار اڑتا دکھائی دیتا ہے جس کی سواری گزر گئی، کسی کو اقربا کی آوازیں اور دوستوں کی باتیں سناتی ہے۔ جو شہرِ خموشاں میں پڑے سوتے ہیں۔ کبھی عزیزوں کی صورتوں اور ان کی طبیعتوں کی تصویریں دکھاتی ہے۔ کبھی پیاروں کے پیارے اور ان کی محبتوں کے افسانے سناتی ہے۔ دل نے حسرت و اشتیاق کو بھی اپنے گوشے میں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ ان باتوں سے ایسے پھولتے اور پھلتے ہیں کہ دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، مگر زمانہ اور اس پر وقت کا گزر جانا حالاتِ مذکورہ کو کچھ کچھ کمزور کرتا ہے۔ ساتھ اس کے یا تو عقل و فہم آ کر حسرت و اشتیاق کو دباتے ہیں یا کوئی اور باہر کا شعور ان سے بھی زبردست آتا ہے، وہ ان کا زور گھٹاتا ہے۔

میں ان ہی خیالات میں پڑا تھا جو نیند آ گئی۔ دیکھتا ہوں کہ "گویا ایک چٹیل میدان، صحرائے بیاباں، سمندر کا کنارہ ہے، اور میں وہاں بہت سے لوگوں میں کھڑا ہوں کہ جن کے سوگوار چہرے ان کے دل کے غم و اندوہ کی گواہی دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے جو دریا بہہ رہا ہے، اس کا چپ چاپ بہاؤ اور سناٹے کا

چڑھاؤ پکار رہا تھا کہ یہاں تھاہ کا پتا نہیں۔ اس دریا کو دریائے اشک کہتے ہیں۔ اسی دریا میں ایک ٹوٹی پھوٹی سی کشتی بھی پڑی ہوئی تھی۔ چناں چہ معلوم ہوا کہ بہت سے مسافر دریا پر جانے والوں نے اضطراب اور بے صبری سے اس میں بیٹھ بیٹھ کر اسے خراب کر دیا ہے۔ مصیبت اس کشتی پر ملاحی کرتی تھی۔ چناں چہ وہ فوراً ہمارے پاس لے آئی۔ ہم بھی سوار ہونے کو تیار تھے کہ اتنے میں ایک بی بی، دیرینہ سال شرم و حیا کا برقع اوڑھے، حلم کی لاٹھی ٹیکتی آئی۔ شفقت مادرانہ سے ایک ایک کا نام پکارا، اور قعر دریا کے خطر بیان کرنے لگی، تاکہ ہم کسی طرح اپنے ارادے سے باز رہیں۔ اکثر لوگوں نے اسے پہچان لیا کہ بی بی صابر خاتون ہیں۔ چناں چہ بعض اشخاص، جو رو رو کر آنکھوں سے دریا بہا رہے تھے، انھوں نے اس کا کہنا مانا اور پیچھے ہٹ آئے۔"

پوچھا جائے گا کہ اگر مولانا آزاد انگریزی نہیں جانتے تھے تو انھوں نے ان مضامین سے کیسے استفادہ کیا؟ یہاں صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ آزاد نے بہ طور خود انگریزی میں خاصی استعداد حاصل کر لی تھی، اور یہ تراجم بحیثیت مجموعی ان کی اپنی ہی کاوش کا نتیجہ ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کسی مستند انگریزی دان کی اعانت بھی حاصل تھی جو مشکل مفاہیم و مطالب کے سمجھنے میں ان کی مدد کرتا تھا۔ مثال کے طور پر "علوم کی بدنصیبی" میں انھوں نے "Astrea" کا ترجمہ "کوکب جمال" کیا ہے، جس سے مصنف کے حسن ذوق اور جدت کا پتا چلتا ہے، لیکن یہ کہ اس کے لغوی اور صنمیاتی معانی تک ان کی رسائی محض اپنے ذاتی علم کی مدد سے ہوئی تھی، قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان مضامین کے مواد کے متعلق آزاد کے معاصروں نے قیاس آرائیوں سے آگے بڑھ کر نیرنگ خیال کے مقدمے کو بغور پڑھنے کی کوشش نہ کی۔ کیوں کہ اس کے مطالعے سے اس معاملے کی بخوبی عقدہ کشائی ہو سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد وہاں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے ہیں اور بہت کچھ کہتے ہوئے بہت کم کہا ہے۔ ان کی زبان مبہم ہے جس سے قاری کو صحیح واقعات کا سراغ نہیں ملتا:

مثال کے طور پر ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ شوق روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر ملتی ہیں، جنھیں یہاں

"اسے" (Essay) یا جواب مضمون کہتے ہیں۔"

اس کے بعد یونانی اور رومی صنمیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اور یہ بہت دشوار ہے کیوں کہ اگر لکھنے میں تصرف کریں تو ترجمہ نہ رہا، اور اصل کی رعایت کی تو کتاب معمائے دقیق ہو گئی۔ یہ مضامین جو لکھے گئے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں، ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکرِ مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے لکھ دیا۔"

اور "علمیت اور ذکاوت کے مقابلے" پر یہ فٹ نوٹ لکھا ہے:

"انگریزی میں "وٹ" اور "لرننگ" کا مقابلہ تھا۔ میں نے "وٹ" کے واسطے بہت خیال کیا، کوئی لفظ نہ ملا، ناچار "ذکاوت" لکھ دیا۔"

اوپر کہا گیا ہے کہ یہ مضامین تمثیلی ہیں۔ تمثیل اس وقت معرضِ وجود میں آتی ہے، جب ایک کہانی یا تصویر میں ایک سے زیادہ معنی ہوں۔ ایسے معانی جو اصلی معنی پر اضافہ کیے گئے ہوں اور جو اس کے متوازی ہوتے ہوئے بھی اس سے مختلف ہوں۔

یہاں تمثیل کی تاریخ کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ اگرچہ لفظ "Allegory" یونانی زبان سے ماخوذ ہے لیکن یونانی اور رومی ادب میں اس کی کوئی مستند مثال نہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ زمانہ مابعد میں ہومر اور ہسیڈ کی تصانیف کو تمثیلی معانی پہنانے کا عام رواج تھا۔ انگریزی ادب میں اس کی مشہور مثالیں "Pier Ploughman, Travels, Gulliver, Pilgirm's Progress" اور Faerie Quene ہیں۔ فرانسیسی ادب میں اس کی مشہور ترین مثال Roman de la Rose ہے جس کا موضوع جنسی محبت ہے۔

آج کل تمثیل کا رواج بہت کم ہے، اور براہِ راست اظہار، خیالات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ تمثیل کی تائید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک سے زیادہ معنی کی وجہ سے قاری کے حاسۂ تجسس کو تحریک ہوتی ہے اور وہ اپنی کامیابی پر شاد کام ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی مدد سے فکری کاوش کی بے کیف روداد کو ایک افسانوی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ادبی لحاظ سے نیرنگ خیال کو وہ مقام حاصل نہیں جو باتفاق رائے آبِ حیات، سخندانِ فارس اور قصص ہند کو حاصل ہے۔ آزاد کی دنیا گوشت پوست کے انسانوں کی دنیا ہے اور وہ اُس کی دل چسپیوں، بوالعجبیوں، رنج و غم اور نشاط کی روداد کو اپنا مطبوع مشغلہ بنائے رہا۔

مجرّد خیالات سے اسے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب وہ مجرّد خیالات کو پیش کرتا ہے تو وہ محسوسات میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور انسانی روپ دھار لیتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ اس نے اس تصنیف میں خالص تمثیل کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ وہ شخص جو بار بار اور غیر شعوری طور مندرجہ ذیل قسم کے مرقع پیش کرے، اس کے لیے تمثیل ایک جانی پہچانی، روز مرہ کی چیز اور عین فطرت ہے۔

> ''نفسِ ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالمِ وجود میں آئی تھی، مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولی نے آ کر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی کہ اس بچے نے انگڑائی لے کر کروٹ لی اور اثر اس کا دفعۃً حرارتِ برقی کی طرح دل دل میں دوڑ گیا۔''

اور:

> ''یہ نظم اُردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اوّلیت کا تاج رکھا گیا، جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کیے، اور مضامین کی رائج الوقت دست کاری سے مینا کاری کی۔ جب کشورِ وجود میں پہنچا تو ایوانِ مشاعرہ کے صدر میں اس کا تخت سجایا گیا۔ شہرتِ عام نے جو اس کے بقائے نام کا ایوان بنایا ہے، اس کی بلندی اور مضبوطی کو ذرا دیکھو اور جو کتبے لکھے گئے ہیں، اُنھیں پڑھو۔ دنیا تین سو برس دور نکل آئی ہے، مگر وہ آج تک سامنے نظر آتے ہیں اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔''

بلحاظِ اسلوب، ترجمہ یا اس کے قریب تر ہونے کے باوجود نیرنگ خیال کے اسلوب میں روانی، بے ساختہ پن اور لچک ہے۔ اٹھارویں صدی میں انگلستان میں نثر کا دور دورہ تھا اور سوفٹ، ڈرائیڈن، ایڈیسن اور سٹیل کے ہاتھوں وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس دور کے بہترین مصنفین کے خیالات کو اُردو میں (جس میں نثر نگاری کا ابھی آغاز ہو رہا تھا اور جو فکری لحاظ سے اپاہج تھی) اس خوبی سے ادا کرنا کہ زورِ بیان میں کوئی کمی نہ ہو، اور قدم قدم پر طبع زاد تخلیق کا گمان ہو، آزاد کا بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن ترجمہ پھر بھی ترجمہ ہے، اور آزاد اس کی ذمہ داریوں سے تمام تر عہدہ برآ نہیں ہو سکے، اور کتاب میں کئی ایسے مقامات ہیں جہاں اشکال، ابہام اور اُلجھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ ان تمام مضامین میں ''شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار'' کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ اس لیے کہ اس کا موضوع مجرّد خیالات کے بجائے انسانی فطرت اور کردار کی نقاشی ہے، اور جس خوبی سے انھوں نے سعدی اور غالب کی تصاویر اس

میں پیش کی ہیں، وہ درحقیقت مرقع نگاری کی معراج ہے۔

ادبی لحاظ سے وہ مضامین مقابلۃً زیادہ دل چسپ ہیں، جن میں ایک یا دو مرکزی خیالات کو تمثیلاً پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سیرِ زندگی میں جہاں کرداروں کی بھرمار ہے اور ان کے شجرہ نسب اور اقربا کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے، وہاں قاری خیالات کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ کھو دیتا ہے۔

کسی تصنیف کی عظمت، بل کہ یوں کہیے کہ کام یابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ قاری کے حافظے پر کتنا واضح یا گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ دنیا کے بہترین شہ کاروں کے نقوش ہمیشہ کے لیے ہمارے دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ ''شہرتِ عام اور بقاے دوام کا دربار'' کے اہم کردار اسی قسم کے ہیں۔ ''علمیت اور ذکاوت کے مقابلے''، ''خوش طبعی'' اور ''نکتہ چینی'' کے کرداروں میں یہ بات نہیں۔ باوجود یہ کہ آزاد نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی، جہاں مغربی اثرات کارفرما تھے اور جس میں پرانی قسم کی مقفّیٰ عبارت کو ناپسند کیا جاتا تھا، مگر آزاد پرانی روایات سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ ان سے دامن نہ بچا سکے۔ ان میں سے ایک قوافی کا استعمال ہے جس کی اس تصنیف میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

نیرنگ خیال کی تصنیف سے بہت پہلے انگلستان میں تمثیل نگاری کا زور ختم ہو چکا تھا، اور وہ انگریزی کتابیں جو ہمارے ہاں داخلِ نصاب تھیں، ان میں تمثیل کی مثالیں شاز و نادر ہی ملتی تھیں؛ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ادب میں نیرنگِ خیال کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا۔

نیرنگِ خیال

دیباچہ

تماشا گاہِ عالم میں جو اہل نظر ایک نگاہ سے میدانِ ماضی اور ایک سے حال واستقبال کی سیر دیکھ رہے ہیں، انھیں صاف نظر آتا ہے کہ ملک ہمارا عنقریب آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا چاہتا ہے۔ نئے نئے علوم ہیں، نئے نئے فنون ہیں، سب کے حال نئے ہیں، دل دل کے خیال نئے ہیں۔ عمارتیں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں، رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں۔ اس طلسمات کو دیکھ کر عقل رسا حیران ہے۔ مگر اسی عالم حیرت میں ایک شاہ راہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سولزیشن (تہذیب) کی سواری، شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانے کو جھاڑ بہار رہا ہے، اور جس حال میں ہے، اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے۔

جو نقشے کھنچ رہے ہیں اور جو بنیادیں پڑ رہی ہیں، اگر چہ ابھی تک کچھ اصل نہیں رکھتیں، لیکن جو نظر باز تجربے کی عینک سے دیکھ رہے ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ بنیادیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں گی اور آبادیاں روئے زمین پر چھا جائیں گی۔ وہ بنیادیں کیا ہیں؟ اور نقشوں سے کیا مراد ہے؟ ہاں، نقشے کتب علوم وفنون ہیں اور بنیادیں تصانیف بوقلموں ہیں جو کچھ سود و بہبود ہماری قسمت میں ہے، انھی بیانوں اور اندازوں پر ہمیں ملے گا۔

اب تک اس ملک نے اپنی غریب حالت کے سبب جب بہت سا سرمایہ تصنیف کا بہم پہنچایا، اور آج سے پچاس ساٹھ برس پیچھے ہٹ کر دیکھیں تو ہمارے عام مطالب واغراض بل کہ بات بات میں زمین و آسمان کا فرق آ گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علوم وفنون انگریزی جس طرح ہمارے لباس، مکانات، حالات، خیالات اور معلومات سابقہ میں ترمیم کر رہے ہیں، اسی طرح اس کی انشا پردازی بھی ہماری انشا میں اصلاح دیتی جاتی ہے لیکن علم زبان میں اس فرق کا امتیاز کرنا ہر شخص کا کام نہیں، جنھیں ان کا مذاق ہے، وہی سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں جو کچھ اُردو کا رنگ نکلا تھا، سبزۂ خودرو کی طرح نکلا تھا۔ خاص و عام کے دلوں کی اُمنگ تھی، جدھر جھک گئے اُدھر جھک گئے۔ خاص شخص کی یا خاص اصول کی کوشش نہیں ہوئی اور اب تک یہ حال ہے کہ تاریخ، فروغ ریاضی وغیرہ اکثر علوم کی کتابیں ترجمہ اور

تصنیف ہوئیں، مگر فنِ انشا کی طرف کسی نے خیال نہ کیا۔

زبان اُردو ایک لاوارث بچہ تھا کہ اُردوے شاہ جہانی میں پھرتا ہوا ملا۔ کسی کو اس غریب کے حال کی پروانہ ہوئی۔ اتفاقاً شعرانے اُٹھالیا اور محبت سے پالنا شروع کیا۔ اِن ہی کے کھانے سے خوراک پائی، انھی کے لباس سے پوشاک پہنی، انھی سے تعلیم کا سرمایہ لیتا رہا۔ اسی واسطے انھی کی زبان سے بولنا سیکھا، انھی کے قدموں پر چلنا سیکھا، انھی کے خیالات اُس کے دل و دماغ میں سمائے۔ حالت اس کی یہ رہی کہ علما تو درکنار، ادنا ادنا آدمی اُردو میں لکھنا ہتک سمجھتے تھے۔ جب ۱۸۳۵ء میں اُس نے دفاترِ سرکاری میں دخل پایا، ساتھ ہی اخباروں پر قبضہ ہوگیا، تب لوگوں کی نظروں میں عزت و وقار ہوا، اور رفتہ رفتہ کل ہندوستان پر قبضہ ہوگیا۔

غرض کہ زبانِ اُردو کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے، وہ شعراے ہند کی کمائی ہے، جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے یہ مفلس زبان علمی الفاظ میں تو اس لیے تہی دست رہی کہ یہ ملک کی علمی زبان نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ عام مطالب کے ادا کرنے میں بھی مفلس ہے۔ چناں چہ اگر تاریخ یا کسی قسم کی سرگزشت اس زبان میں لکھیں تو جو اصلی حالت یا اپنے دل کا ارمان ہے، وہ نہیں نکل سکتا۔ اسی واسطے اس کا اثر بھی جیسا کہ جی چاہتا ہے، پڑھنے والے کے دل تک نہیں پہنچتا۔ بات یہ ہے کہ اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ انتہا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اُڑی، لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی، وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہوگئی۔

اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطالب میں محصور ہے۔ مضامین عاشقانہ، گلگشتِ مستانہ، نصیبوں کا رونا، اُمید موہوم پر خوش ہونا، اُمرا کی خوشامد، جس پر خفا ہوئے اس کی خاک اُڑانی۔ البتہ ان رنگوں میں اُس نے لطافت اور نازک خیالی کو اس درجے تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا۔ اور اس قسم کے الفاظ و مطالب کا عمدہ ذخیرہ اس کے پاس ہے۔ فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں، جن کے خیالات، باریکی اور تاریکی عبارات میں جگنو سے اُڑتے نظر آتے ہیں، لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصلی ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں۔ ایسی ماں کا دودھ پی کر اُردو نے پرورش پائی تو اس کا کیا حال ہوگا؟

اے اہلِ وطن! آج وہ دن ہے کہ علوم کے ایوانِ شاہانہ میں دربار لگا ہوا ہے۔ ہر ایک زبان اپنے اپنے ملک کی خدمتیں لے کر حاضر اور قدرت اور عظمت کے درجوں پر قائم ہے۔ تمھیں کچھ معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری زبان کس درجہ پر کھڑی ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ نہایت ادنا درجے پر ہے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی ہے مگر کوئی بڑھانے والا نہیں۔ ہاں اس کا بڑھنا تمھارے ہاتھ میں ہیں۔

زبانِ انگریزی بھی مضامین عاشقانہ، قصہ وافسانہ اور مضامین خیالی سے مالا مال ہے، مگر کچھ اور ڈھنگ سے۔ اس کا اصلی اصول یہ ہے کہ جو سرگزشت بیان کرے، اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے، اور نشتر اس کا دل پر کھٹکے۔ اسی واسطے خیالی پھول پتے اتنے ہی لگاتے ہیں جتنے اصل ٹہنیوں پر سجتے ہیں، نہ کہ شاخ وشجر سب غائب ہو جائیں، فقط پتوں کا ڈھیر ہی رہ جائے۔ بے شک فنِ انشا اور لطفِ زبان تفریحِ طبع کا سامان ہے، لیکن جس طرح ہمارے متاخرین نے اُسے ایک ہی مرض کی دوا سمجھ لیا ہے، انگریزی میں ایسا نہیں۔ اہلِ فرنگ نے جس طرح ہر امر کی بنیاد ایک منفعت پر رکھی ہے، اسی طرح اس میں بھی موقع موقع سے مختلف منافع مدِ نظر رکھے ہیں۔ زبانِ انگریزی میں نظم کا طور کچھ اور رہا ہے، مگر نثر میں بھی خیالی داستانیں یا اکثر مضامین خاص خاص مقاصد پر لکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وسعتِ خیال اور پروازِ فکر اور تازگیِ مضامین اور طرزِ بیان کا انداز قابل دیکھنے کے ہے۔ میں نے انگریزی انشا پر دازوں کے خیالات سے اکثر چراغِ شوق روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنھیں یہاں جواب مضمون (اے، Eassy) کہتے ہیں۔ ان میں انواع واقسام کی غرضیں ملحوظ ہیں، مگر بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی روشنی ابھی ہمارے دل ودماغ تک نہیں پہنچی۔ بعض مضامین وہ ہیں، جن میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے۔ انھیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا ہے، اور ان کے معاملات اور ترقی وتنزل کو سرگزشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ اُن میں شگفتگیِ طبع کے علاوہ یہ غرض رکھی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی صفتِ پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلقِ بد سے نفرت ہو، یا کسی حصولِ مطلب کے رستے میں جو نشیب وفراز آتے ہیں، اُن سے واقف ہو۔ اگر چہ اس میں طرزِ بیان کا وہ طور نہیں جو ہم اُردو، فارسی میں پڑھتے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی فصیح اُردو زبان پر قادر ہو تو انھیں پڑھے اور اُن کے رنگ سے اپنے کلام کے چہرۂ حال کو ایسے خدوخال سے آراستہ کرلے کہ خاص وعام کی نظر میں کھب جائے۔ البتہ ایسی قدرت حاصل ہونی مشکل ہے، اور مشکل تر یہ ہے کہ انگریزی میں یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسوم قدیم کی باتیں اب تک انشا پردازی کا جزو ہیں۔ رومی و یونانی ستارہ ہائے فلکی اور اکثر قوائے روحانی کو دیوتا مانتے تھے۔ چناں چہ انگریزی میں بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں، جن کی چشمِ سخن ہر بات میں ان کے قصوں پر اشارے کرتی جائے مگر اُردو کے باغ نے فارسی اور عربی کے چشموں سے پانی پایا ہے، وہاں دیوی دیوتا کا گزر نہیں اور یہ سخت دشواری ہے، کیوں کہ اگر لکھنے میں کچھ تصرف کریں تو ترجمہ نہ رہا، اور اصل کی رعایت کی تو کتاب معماے وقیق ہوگئی، نہ کہ رفیقِ تفریح۔

حق یہ ہے کہ مجھ نا قابل کو ایسے موقع پر قلم اُٹھانا ان مضامین کو ذبح کرنا ہے، لیکن اب وہ زمانہ بھی

نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں، ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں، یا پریاں اُڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اور وقت ہے۔ اسی واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے۔ علوم وفنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں چاہئیں، جو صاف شفاف تصویریں رسوم واخلاق کی ہماری بزمِ کلام میں سجائیں۔ ان میں جو ہمارے داغ دھبے ہیں، سب نظر آئیں، اور آپ تاثیر سے دھوئے جائیں۔ تم دیکھتے ہو! بے جان مورتوں میں جان پڑنے کی ساعت آ گئی ہے۔ قریب ہے کہ شائستہ زبانوں کی طرح ہماری زبان بھی جان بخشی کی تاثیر پیدا کرے۔ اس تقریر سے یہ غرض نہیں کہ زبان کے کپڑے اتار کر ننگا منگا کر دو، استعارہ اور تشبیہ کا نام نہ رہے۔ ہاں ایسے کپڑے پہناؤ کہ اصلی حسن کو روشن کر دیں، نہ کہ اندھیرا چھا جائے۔ کیوں کہ اور زبانوں میں کیا ہے جو ہماری زبان میں نہیں؟ ہاں طرز بیان کا ایک ڈھب ہے، وہ تقریر میں آ جانا چاہیے، فقط اتنی ہی کمی ہے۔

اے جوہر زبان کے پرکھنے والو! میں زبانِ انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں، اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ اُردو کے میدان میں بھی سوار نہیں پیادہ ہوں، اس لیے یہاں بھی درماندہ ہوں، پھر بھی یا الٰہی دیکھو کہ شہسواروں کے ساتھ دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ جتنا نالائق ہوں، اُتنا ہی شائق ہوں۔ دل سے لاچار ہوں کہ باوجود موانع مذکور کے جو لطف طبیعت کو بعض مضامین انگریزی سے حاصل ہوا، نہ چاہا کہ اپنے پیارے اہلِ وطن کو اس میں شامل نہ کروں۔ جس قدر ہو سکے اور جس طرح ہو سکے ایک پرتو اُردو میں دکھانا چاہیے۔ بالفرض مجھ سے بیان کا حق ادا نہ ہوگا، ایک رستہ تو نکل آئے گا۔ زبان کے اہلِ ذوق بڑے بڑے صاحبِ قدرت ہیں اور ہوں گے۔ کوئی نہ کوئی منزلِ مقصود تک پہنچے گا۔

یہ چند مضمون جو لکھے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اُسے لکھ دیا۔ اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس! اُسے دیکھ کر کیا سمجھیں گے۔ اکثر نازک دماغ تو کہہ دیں گے کہ واہیات ہے۔ بہت کہیں گے کوئی کہانی کہی ہے مگر مزا نہیں۔ ''جو بڑے معتبر ہیں، وہ کہیں گے کہ'' ہے، مگر غور طلب ہے۔'' بے شک یہ کہانان کا اصلیت سے خالی نہیں، کیوں کہ خیالی تصویریں حکمت واخلاق کی ہیں۔ فکر کے قلم نے خاکہ ڈالا ہے اور استعارہ وتشبیہ نے رنگ دیا ہے۔ طبیعتیں رستے سے آشنا نہیں۔ سبب یہ کہ ملک میں ابھی اس طرز کا رواج نہیں۔ خیر، آزاد! ناامید نہ ہونا چاہیے:

تمھاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے، کبھی تو دیکھے گا

اُردو، انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہارِ مطالب کا وسیلہ ہی کہیں تو گویا وہ ایک اوزار ہے کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچۂ نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں، وہی اس سے ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعۂ فولادی تیار کر دے، جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے، اور چاہے تو ایک بات میں اُسے خاک میں ملا دے، جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے، اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے، ان سے حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ایک نادر مرصّع کار ہے کہ جس کی دست کاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نو لکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زرو جواہر اس کی قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیّار ہے جو ہر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے قفل کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یا مصوّر ہے کہ نظر کے میدان میں مرقّع کھینچتا ہے یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اسے پھول، گل، طوطی و بلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے۔ اس نادر دست کار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح موقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں، لیکن اس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوش نما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال چہچہا کر دیتا ہے۔ پھر بے اس کے کہ بوند پانی اس میں ڈالے، ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے کہ کبھی نارنجی، کبھی گلناری، کبھی آتشی، کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بوقلموں اور رنگا رنگ اور پھر سرتا پا عالم نیرنگ۔ جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں اس میں بڑے بڑے نازک قلم مصوّر گزر گئے ہیں، جن کے مرقّعے آج تک آنکھوں اور کانوں کے رستے سے ہمارے اور تمھارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہو گئی ہیں، جس سے تمھاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مرقّع تیار کرنے کے قابل نہیں

رہی، اور تعلیم یافتہ قومیں اُسے سن کر کہتی ہیں کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔

میرے دوستو! یہ قول ان کا حقیقت میں بے جا نہیں ہے۔ ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزت پاتی ہے تو دو سبب سے پاتی ہے: اول یہ کہ اس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں، دوم اُس کی انشا پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونوں صفتیں ہیں مگر ناتمام ہیں اور اس کے سبب ظاہر ہیں۔

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مفلس ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اس کی ولادت کو ہوئے۔ اُس کا نام "اُردو" خود کہتا ہے کہ میں علمی نہیں، بازار کی زبان ہوں۔ اُٹھتے بیٹھتے، لین دین کی باتوں کے لیے کام میں آتی ہوں۔ سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا، مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک بچہ شاہ جہاں کے گھر میں پیدا ہوا اور انگریزی اقبال کے ساتھ اس کا ستارہ چمکا۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے تو انھوں نے ملکی زبان سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا، مگر سوائے چند دیوانوں کے اس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی۔ ان کی فرمایش سے کئی کتابیں کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں، تصنیف ہوئیں اور انھی کے ڈھب سے صرف و نحو بھی درست ہوئی۔ ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۳۶ء میں ایک اُردو اخبار جاری ہوا ۱۸۴۲ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اِسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں، اور اُردو نے برائے نام زبان کا تمغہ اور سکہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ جس کی تصنیفی عمر کل ۷۰-۷۲ سال کی ہو اس نے بساط کیا اور اس کے الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا۔ پس اس وقت ہمیں اس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحبِ سرمایہ کہنا بے جا ہے۔ ہر زبان اہلِ زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے، اور کسی ملک والے کا یہ کہنا کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی ملک کے الفاظ بولیں، بالکل بے جا ہے۔

عربی زبان بھی ایک علمی زبان تھی، مگر دیکھ لو، اس میں سارے لفظ تو عربی نہیں۔ صدہا

رومی، صدہا یونانی، صدہا فارسی، کے الفاظ ہیں، وغیرہ وغیرہ، اور زبانِ فارسی کا تو کچھ ذکر ہی نہیں، انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے، مگر اس میں بھی غیر زبانوں کے لفظوں کا طوفان آ رہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہلِ ملک میں علم آتا ہے، پھر علمی اشیا کے لیے الفاظ یا تو اس علم کے ساتھ آتے ہیں یا وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں۔ علمی الفاظ کا ذخیرہ خدا نے بنا کر نہیں بھیجا، نہ کوئی صاحب علم پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا ہے؛ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں، ویسے ہی ان کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اوّل خاص و عام میں علم میں پھیلتا ہے، ساتھ ہی اس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں۔ مثلاً ریل کا انجن اور اس کے کارخانے کے صدہا الفاظ ہیں کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے ہوئے تو ادنا ادنا خواندے سب جان گئے۔ اگر بے اس کے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈتے، یا پہلے یاد کرواتے تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اسی طرح مثلاً میجک لینٹرن اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اس کا وہی نام لیں، خواہ فانوسِ جادو کہیں، خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں، ہرگز کوئی نہیں سمجھے گا، لیکن اگر وہ مشاہدے میں عام ہو جائے اور گھر گھر میں جاری ہو جائے تو اُلٹے سے اُلٹا اس کا نام رکھ دیں، وہی بچے بچے کی زبان پر مشہور ہو جائے گا اور وہی سب سمجھیں گے۔ انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں، مثلاً ٹیلی گراف، یا الیکٹرسٹی وغیرہ وغیرہ، ان میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے، مگر چوں کہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں، اس لیے الفاظ مذکور بھی ایسے عام ہے کہ سب بے تکلف سمجھتے ہیں۔ پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے تو اس سبب سے ہے کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔ اب اس کی تدبیر ہو سکتی ہے تو اہلِ ملک ہی سے ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود علوم و فنون حاصل کرو، اپنے ملک میں پھیلاؤ اور بھائی بندوں کو اس سے آگاہ کرو۔ جب اس میں سب قسم کے کاروبار ہوں گے تو ان کے الفاظ بھی ہوں گے۔ ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائے گا۔

تمھاری انشا پردازی پر جو نقص کا الزام ہے، وہ بھی کچھ درست ہے اور کچھ قابلِ چشم پوشی کے ہے۔ یہ تو ابھی بیان ہوا کہ زبانِ مذکور علمی زبان نہیں۔ سو برس ہوئے کہ ہندستان کے رنگین مزاجوں نے فقط اس حب الوطنی سے کہ ہماری زبان بھی اور زبانوں کی طرح نظم سے خالی نہ ہو، ا

س میں اپنی مرصّع کاری اور نقش و نگاری دکھانی شروع کی، اور حق یہ ہے کہ ۱۲۱۵ء تک جو کچھ زور اُس نے پایا، انھی کی بدولت پایا۔ انشاپردازی کا قاعدہ ہے کہ ابتدا میں جو مطلب کسی زبان میں ادا ہوتے ہیں تو ان میں سیدھی سادی تشبیہیں اور قریب قریب کے استعارے خرچ ہوتے ہیں۔ اسی واسطے جو مطالب اس میں ادا کیے جاتے ہیں وہ سنتے ہی سمجھ میں آ جاتے ہیں، کیوں کہ ان کے پاس پاس کے استعارے اور ان چیزوں کی تشبیہیں، جو آنکھوں کے سامنے ہمارے آس پاس موجود ہیں، وہ فقط مطلب مذکور کو سمجھاتے ہی نہیں بل کہ اپنی رنگینی اور لطافت سے اُس کے لطف کو روشن کر کے دکھاتے ہیں، اور چوں کہ سادگی اور آسانی کے سبب سے انھیں سب سمجھتے ہیں، اس لیے سب کے دل اس کی تاثیر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چند روز کے بعد قریب قریب کی تشبیہیں اور استعارے تو خرچ ہو جاتے ہیں اور آس پاس کی تشبیہیں عام تام ہو کر تمام ہو جاتی ہیں۔ نئی نسلیں دستمال تشبیہوں اور استعاروں کو برتنا چبائے ہوئے نوالے کا چبانا سمجھتی ہیں، لیکن علم اور مشق، جو مختلف رستوں سے آگاہ کر دیتے ہیں، اس لیے اُن کے فکر کبھی دائیں بائیں پھیلتے ہیں اور کبھی بلند ہونا شروع کرتے ہیں، اور دور دور ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ فارسی اور اُردو زبان میں جو کیفیت اس کی گزری ہے، اس وقت میں اُسی کا اشارہ کرتا ہوں کہ شعرا نے مستعمل استعاروں سے بچنے کے لیے استعارہ در استعارہ نکال اور اسے ایک ایجادِ دل پذیر تصوّر کر کے نازک خیالی نام رکھا۔ چوں کہ دنیا میں ہر ایک نئی چیز بہت مزہ دیتی ہے اس لیے اوروں نے بھی اُسے پسند کیا، اور علم کی مشکل پسندی نے اُسے زیادہ قوت دی، اور یہ معاملہ روز بہ روز زور پکڑتا گیا۔ چناں چہ ان بلند خیالوں میں دنیا کے کاروبار، مثلاً خط و کتابت یا تاریخی مقاصد یا علمی مقاصد یا علمی مطالب کا ادا کرنا تو بہت دشوار تھا، مگر ایک فرقہ پیدا ہوا، جنھوں نے خیال بند کا خطاب حاصل کیا۔ ان ہی کی نثر میں پنج رقعہ، مینا بازار، چار عنصر وغیرہ اور نظم میں جلالؔ اسیر، قاسمؔ مشہدی، بیدلؔ، ناصرؔ علی اور ان کے مقلدوں کے دیوان موجود ہیں۔ چناں چہ دونوں کے امتیاز کے لیے دو شعر بھی اس مقام پر لکھتا ہوں۔ پہلے طریقے میں ایک استاد کہتا ہے۔

سحر خورشید لرزاں بر سرِ کوئے تو می آید

دل آئینہ را نازم کہ بر روئے تو می آید

دیکھو ناصر علی سرہندی اسی مضمون کو اپنی نازک خیالی کے زور سے الگ کرتے ہیں:

نیارد چشمِ بیدل تابِ حسنِ بے حجابش را
کہ باشد صافیِ آئینہ شبنم آفتابش را

چوں کہ اُردو نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی تھی، اس لیے چند روز کے بعد یہی وقت اُسے بھی پیش آئی۔ میر سوزؔ، میر تقیؔ، سوداؔ، جرأتؔ وغیرہ کے زمانے تھے۔ ان میں اگر چہ مضامین شاعرانہ تھے، مگر زبان میں ابتدائی خوبی موجود تھی۔ بعد اُن کے وہی استعاروں کے اینچ پینچ اور خیالوں کی معمولی ترقی شروع ہوئی۔ البتہ خال خال آدمی ایسے تھے جو بزرگوں کی تقلید سے صفائی اور سادگی کی لکیر پر فقیر رہے۔ مثلاً قدما میں خواجہ میر درد کہتے ہیں۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

متاخرین میں غالبؔ نازک خیال اس سے الگ ہو کر کہتے ہیں:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

بہر حال ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ جو کچھ لطافت یا زور ہماری زبان میں پیدا ہوا، انھی شعرا کی برکت سے ہوا، مگر وہ عاشقانہ مضامین کے ادا کرنے کے سامان اور تغزل کے خوش نما انداز اور اس کے الفاظ اور ترکیبوں کی دل آویز تراشیں تھیں۔ بھلا خیالاتِ فلسفہ کے سامان، علوم کی اصطلاحیں، مختلف مضامین تاریخی کے ادا کرنے کی طاقت، دلائل و براہین کے لڑانے کے زور اس میں کہاں سے آتے؟ اگر چہ ابتدا میں جو کچھ تھا یہ رنگ بہت خوش نما تھا، مگر اب دیکھتا ہوں تو زمانے کے انداز نے اُسے بھی پھیکا کر دیا ہے، اور تمھاری انشا پردازی کا یہ حال ہو گیا ہے کہ غیر قوموں میں تو جو کچھ کہیں بجا ہے، مَیں خود دیکھتا ہوں اور شرماتا ہوں، کیوں کہ مستعمل چیز میں شگفتگی اور تازگی دکھانی بہت مشکل ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ایک خزانہ معمورِی کا تمھارے ہاتھ آ گیا ہے، مگر اتنا ہے کہ وہ انگریزی قفلوں میں بند ہے، جس کی کنجی انگریزی زبان ہے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح ہم فارسی، عربی کے الفاظ اُردو میں بولتے ہیں،

اسی طرح انگریزی الفاظ بولنے لگیں یا ان کے محاوروں اور اصطلاحوں کے ترجمے اُردو میں استعمال کرنے لگیں، لیکن تم خیال کرو کہ عبارت اور الفاظ حقیقت میں انسان کے خیالات اور مقاصد کے لباس ہیں، اور چوں کہ طبعی خیالات فرقہ ہائے انسان کے ہمیشہ قریب قریب ہوتے ہیں، اس لیے وہ جس ملک میں جاہیں رنگِ ظہور دکھائیں، اصلیت میں کچھ نہ کچھ ملتے جلتے ہی ہوں گے، بل کہ اِن میں بعض ڈھنگ ایسے ہوں گے کہ ذرا رنگ پلٹ کر جاہیں گے تو دوسری طرف آجائیں گے اور نئی بہار دکھلائیں گے۔ چناں چہ جب بہ نظرِ غور دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ دو قوموں کے ارتباط سے ہمیشہ ایک زبان دوسری زبان سے پرتو لیتی رہی ہے۔ دیکھو لو بھاشا پر جب فارسی عربی آکر گری تو اس کا کیا اثر ہوا، اور اب انگریزی کیا اندرونی اثر کر رہی ہے۔ فارسی اُردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانے یا زندگی کو عمرِ رواں یا آبِ گزراں کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو یا رسنِ عمر کو کاٹ رہا ہے اور یہ بھی کہ:

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غصے کے باب میں دیکھا ہوگا کہ اُسے آتشِ غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہتے ہیں کہ ''ہمچو مارِ سیاہ بر خود پیچید'' اور کبھی جوشِ غضب کے لیے کہتے ہیں کہ ''آتش از چشمش پرید۔ دود از نہادش بر آمد'' اور ''ہمچو سپند از جا بر جست''۔ پس انگریزی میں متھالیجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسم دیبی یا دیوتا مقرر کیا ہے، اور ان ہی سامانوں سے سجایا ہے جو اُن کے لیے لازم اور شایانِ شان ہیں۔ چناں چہ:

وقت:

ایک پیر کہن سال کی تصویر ہے، اس کے بازوؤں میں پریوں کی طرح پر پرواز لگے ہیں کہ گویا ہوا میں اُڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ میں شیشۂ ساعت ہے کہ جس سے اہلِ عالم کو اپنے گزرنے کا اندازہ دکھاتا جاتا ہے اور ایک میں درانتی ہے کہ لوگوں کی کشتِ اُمید یا رشتۂ عمر کو کاٹتا جاتا ہے۔ یا ظالم خون ریز ہے کہ اپنے گزرنے میں ذرا رحم نہیں کرتا۔ اُس کے سر پر ایک چوٹی بھی رکھی ہے کہ جو دانا ہیں اُسے پکڑ کر قابو میں کر لیتے ہیں، لیکن اوروں کی چوٹیاں پیچھے ہوتی ہیں، اس کی چوٹی آگے رکھی ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو وقت گزر گیا وہ قابو میں نہیں آسکتا۔ ہاں جو پیش

ہیں ہو وہ پہلے ہی سے روک لے۔

غصہ:

ایک عورت ہے؛ کالا رنگ، ڈراونی صورت، تمام بدن پر بال کھڑے ہیں، جیسے لوہے کی سلائیں، سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اُٹھائے لہرا رہے ہیں، اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

بعض تصویروں میں اس کے دو پر ہیں کہ اڑائے لیے جاتے ہیں، اور اس کے ہاتھ میں شعلۂ آتش ہے کہ دم بدم بھڑکتا چلا جاتا ہے، اور ایک ہاتھ میں خون ریزی کا برچھا ہے۔

عشق:

ایک موقع پر اسے نوجوان، خوب صورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے اور اپنے عالم میں اُچھلتا کودتا ہے، مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا۔

کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جوڑ رکھا ہے کہ جدھر چاہتا ہے مار بیٹھتا ہے، اس کی پناہ نہیں۔

ایک موقع پر ایسی تصویر کھینچی ہے کہ پہلو میں تیروں کا ترکش لٹکتا ہے اور ہاتھ سے تیر کا پیکان سان پر تیز کر رہا ہے۔

یہ تصویر ایک ہیرے پر کھدی ہوئی ہاتھ آئی تھی، خدا جانے کس عہد میں کھدی ہوگی اور کیا طلسم اس میں باندھا ہوگا۔

افواہ یا شہرت:

اس کی تصویر دیکھی؛ ایک بڑھیا عورت ہے، اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے منہ میں زبان ہلتی ہے، ساتھ ہی ساتھ ساری سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے، وہی عالم میں ایک ایک کی زبان پر آتی ہے۔

حُسن کی پری:

سمندر کے کف سے پیدا ہوئی ہے۔ شاید اس سے جوش و خروش کے ساتھ اس کی لطافت اور

نزاکت کا بھی اشارہ ہو۔ وہ خود بھی محبت رکھتی ہے مگر لڑائی کے دیوتا پر عاشق ہے۔ جس کو وہ نصیب ہو جائے وہ اس کے پرتو جمال سے کامیاب ہو۔ پھولوں میں مہندی، گلاب، سیب، لالہ، نافرمان وغیرہ سے اس کی درگاہ میں نذر چڑھتی ہے۔ فاختہ، ہنس، ابابیل، ہُدہُد وغیرہ اس کے تخت کو اڑاتے ہیں۔ خوشبوؤں کی دھونی اور پھولوں کا ہار اس کا متبرک چڑھاوا ہے۔ انگریزی میں انھیں گاڈز کہتے ہیں، اور ہر ایک جذبۂ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ کے لیے مختلف گاڈز تیار کیے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹا دیا، اس لیے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں، ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیا کے لیے ایک ایک دیبی یا دیوتا ہیں۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں، اور اس کے صنائع بدائع پر نظر کریں، تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کون صانع ہوگا جو ایسی دستکاری کر سکے۔ پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو اور اسی نسبت سے عالمِ موجودات اور اس کے جزئیات کو دیکھو کہ پھر جب دیکھتے ہیں "الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد" یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے، تو ضروری ہے کہ کائنات کے مختلف کار خانوں کے لیے ایک ایک رب النوع فرض کیا جائے، جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو، اور سب کا مالک رب الارباب جامع جمیع صفات کمال۔ اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلے کا ایک ایک فرشتہ موکل مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے ورنہ دیبی یا دیوتا وہی گاڈز، وہی رب النوع، وہی فرشۂ موکل۔ یہ خیال مدت سے دل میں کھٹکتا تھا، چند روز ہوئے کہ شاہ ایران نے جو سفرنامہ یورپ کا آپ لکھا ہے، وہ میری نظر سے گزرا۔ فرانس کے معنی آفرینوں نے ایک جگہ باغ رنگین میں ایک نقلی پہاڑ بنایا ہے اور اس پر بہار کی گاڈس سجائی ہے۔ چناں چہ شاہ نے وہاں پہنچ کر اسے دیکھا اور اپنے بیان میں اسے رب النوع ہی لکھا ہے۔

غرض یہ ہے کہ خیالات کے اتفاقوں کو غور سے دیکھو کہ فقط طبیعت کی تاثیر ہے جس نے مختلف ملکوں میں مختلف طور پر طبیعتوں کے جوش ظاہر کیے ہیں، مگر سب کا راستہ کسی قدر قریب قریب ہو کر نکلا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ جب ایک جذبۂ موہوم کو مجسم فرض کرتے ہیں اور اس کی صفات اور لوازمات کو آنکھوں کے سامنے سجاتے ہیں، تو اس پر طبیعت کی تاثیر پوری

پوری قائم ہوتی ہے، اور جو خیالات اس پر نکلتے ہیں، ٹھیک دوستی کے ساتھ ہوتے ہیں، اور برجستہ الفاظ میں ادا ہوتے ہیں کہ یہی انشا پردازی کا ایمان ہے۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے پہلے انداز پرانے اور مستعمل ہو گئے، تو ہمیں چاہیے کہ انگریزی باغ میں سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجائیں، البتہ دونوں زبانوں میں ایسی مہارت ہونی چاہیے کہ یہ تصرف خوبصورتی کے ساتھ ہو سکے، جیسا کہ ابتدا میں ہماری اُردو فارسی کے انشا پرداز کر گئے اور پھر کہتا ہوں کہ یہ مطلب جب کبھی ہوگا، ان انگریزی دانوں سے ہوگا، جو دونوں زبانوں میں پوری مہارت رکھتے ہوں گے، کیوں کہ ان کی دو آنکھیں روشن ہیں۔ اُردو اپنی زبان ہے، اور انگریزی کنجی خدا نے دی۔ ہم اور ہمارے ساتھی، پرانی لکیروں کے فقیر، جو کچھ کرنا تھا سو کر چکے۔ نہ ان میدانوں میں اب ہم سے کچھ ہو سکے، چقماق کے دونوں جزوں کو ٹکراؤ کہ آگ نکلے۔ اون اور شیشے کو رگڑو کہ الیکٹرسٹی کے فوائد حاصل ہوں۔ لیکن فقط پتھر ہو تو پتھر ہی ہے اور فقط شیشہ ڈر کا گھر۔ اپنی زبان کے زور سے اس میں اس طرح جان ڈالو کہ ہندستانی کہیں سودا اور میر کے زمانے نے عمر دوبارہ پائی۔ اس پر انگریزی روغن چڑھا کر ایسا خوش رنگ کرو کہ انگریز کہیں: ہندستان میں شیکسپیئر کی روح نے ظہور کیا۔

آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا

سیر کرنے والے گلشنِ حال کے اور دُوربین لگانے والے ماضی واستقبال کے روایت کرتے ہیں کہ جب زمانے کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا، اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا تو تمام اولادِ آدم مسرتِ عام اور بے فکریٔ مدام کے عالم میں بسر کرتی تھی۔ ملک ملک فراغ تھا، اور خسروِ آرام رحم دل، فرشتہ مقام، گویا ان کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا، نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا۔ اس کی اطاعت و فرماں برداری اسی میں ادا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گل زاروں میں گلگشت کرتے تھے، ہری ہری سبزے کی کیاریوں میں لوٹتے تھے، آبِ حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے۔ ہمیشہ وقت صبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا۔ نہ گرمی میں تہہ خانے سجانے پڑتے، نہ سردی میں آتش خانے روشن کرتے۔ قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں ایسی موافق پڑی تھیں کہ جاڑے کی سختی یا ہوا کی گرمی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے۔ چلتے چشموں پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے۔ وہ شربت سے سوا مزہ، دُودھ سے زیادہ قوت دیتے تھے۔ جسمانی طاقت قوتِ ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا کہ سیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کی پیداواریں، رنگا رنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے۔ آب وہوا، قدرتی غذائیں تیار کر کے زمین کے دسترخوان پر چن دیتی تھی۔ وہ ہزار مقوی اور مفرح کھانوں کے کام دیتی تھی۔ صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوؤں کے عطر مہک رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچہے، خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے۔ خوب صورت خوب صورت چرند پرند آس پاس کلیل کرتے پھرتے تھے۔ جابجا درختوں کے جھرمٹ تھے، انھی کے سایے میں سب چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش و آرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لیے کمی نہ ہوتی تھی، اور کسی طرح ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا، سب کی طبیعتیں خوشی سے مالا مال اور

دل فارغ البال تھے۔

دیکھو اب انسان کی نیّت میں فرق آتا ہے اور کیا جلد اس کی سزا پاتا ہے:

اتفاقاً ایک میدان وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم مہک گیا، مگر بو اس کی گرم اور تیز تھی۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں، اور ہر ایک کے دل میں خود بخود یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ سامان عیش و آرام کا جو کچھ ہے، میرے ہی کام آئے، اور کے پاس نہ جائے۔ اس غرض سے اس گل زار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آ کر چالاکیاں دکھانے لگے۔ پھر تو چند روز کے بعد کھلم کھلا ان کی ذریات یعنی غارت، تاراج، لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگے۔ جب راحت و آرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ غرور، خود پسندی، حسد نے اس باغ میں آ کر قیام کر دیا۔ ان کے اثرِ صحبت سے لوگ بہت خراب ہوئے، کیوں کہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ لائے۔ پہلے تو خدائی کارخانے فارغ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بموجب کھلے ہوئے تھے، یعنی عیش وافر اور سامان فراواں، جو کچھ درکار ہو، موجود تھا اور اسی بے احتیاجی کو لوگ تو نگری کہتے تھے۔ پھر یہ سمجھنے لگے کہ اگر ہمارے پاس ہر شے ضرورت سے زیادہ ہو اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ ہو، لیکن تو نگر ہم جبھی ہوں گے جب کہ ہمسایہ ہمارا محتاج ہو۔ ہر چند اس بے چارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو، مگر انھیں جب ہمسایے خوش حال نظر آتے تھے تو جل جاتے تھے، اور اپنے تئیں محتاج خیال کرتے تھے۔

جہاں لوٹ مار اور غارت و تاراج کا قدم آئے، وہاں احتیاج و افلاس نہ ہو تو کیا ہو:

اس بدنیتی کی سزا یہ ہوئی کہ احتیاج و افلاس نے بزرگانہ لباس پہنا اور ایک پیرزادہ بن کر آئے۔ حضرتِ انسان کہ طمع خام کے خمیر سے تھے، خسرو آرام کی عقیدت کو چھوڑ کر ان کی طرف رجوع ہوئے۔ چناں چہ سب ان کے مرید اور معتقد ہو گئے اور ہر شخص اپنے تئیں حاجت مند ظاہر کر کے فخر کرنے لگا۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ اس بدنیت، نحس قدم کے آنے سے ملکِ فراغ کا رنگ بالکل بدل گیا، یعنی انواع و اقسام کی حاجتوں نے لوگوں کو آن گھیرا۔ سال میں چار موسم ہو

گئے، زمین بنجر ہو گئی، میوے کم ہونے لگے، ساگ پات اور موٹی قسم کے اناج بھی پیدا ہونے لگے، لیکن جاڑے نے بالکل ناچار کر دیا۔ کبھی کبھی قحط سالی کا ٹڈی دل چڑھ آتا۔ اسی لشکر میں وبا اور امراض کے غول کے غول بیماریاں اپنے ساتھ لے کر آتے اور تمام ملک میں پھیل جاتے۔ غرض عالم میں ایسا تہلکہ پڑا کہ اگر ملکِ فراغ کے انتظام میں نئی اصلاح نہ کی جاتی تو یک قلم برباد ہو جاتا۔ سب دکھ تو سہہ سکتے تھے مگر قحط کی مصیبت غضب تھی۔ چوں کہ یہ ساری نحوستیں احتیاج اور افلاس کی نحوست سے نصیب ہوئی تھیں، اس لیے سب اپنے کیے پر بہت پچھتائے۔

اب پچھتانے سے کیا حاصل ہے، ہاں ہمت کر و اور محنت پر کمر باندھو:

عالم کا رنگ، بے رنگ دیکھ کر تدبیر اور مشورہ دو تجربہ کار دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے، اور ایک سیب کے درخت میں جھولا ڈالے، الگ باغ میں جھولا کرتے تھے۔ البتہ جو صاحب ضرورت ان کے پاس جاتا، اسے صلاح مناسب بتادیا کرتے تھے۔ یہ سب مل کر ان کے پاس گئے کہ برائے خدا کوئی ایسی راہ نکالیے جس سے احتیاج و افلاس کی بلا سے بندگانِ خدا کو نجات ہو۔ وہ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اپنے کیے کا علاج نہیں خسرو آرام ایک فرشتہ سیرت بادشاہ تھا، تم نے اس کا حق شکرانہ ادا نہ کیا اور اس آفت کو اپنے ہاتھوں سر پر لیا۔ یہ افلاس ایسی بری بلا ہے کہ انسان کو بے کس اور بے بس کر دیتی ہے۔ مانگے تانگے کے سوا خدا اس کا کچھ پیشہ نہیں۔ دیکھو! اس نے ملکِ فراغ کو کیسا تباہ کر دیا ہے کہ دلوں کے باغ ہرے بھرے ویران ہوئے جاتے ہیں۔ اب اس کے نکلنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی مگر یہ کہ ہم نے سنا ہے، احتیاج و افلاس کا ایک بیٹا بھی ہے، جس کا نام محنت پسند خردمند ہے۔ اُس کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہے، کیوں کہ اس نے اُمید کا دودھ پیا ہے، ہنرمندی نے اسے پالا ہے، کمال کا شاگرد ہے؛ ہو سکے تو جا کر اس کی خدمت کرو۔ اگر چہ اسی کا فرزند ہے، لیکن اول تو سلطنت کا مقدمہ درمیان ہے، دوسرے ماں کے دُودھ کا زور اس کے بازوؤں میں ہے، استاد کی پھرتی اور چالا کی طبیعت میں ہے، شاید کچھ کر گزرے۔ تدبیر اور مشورے کا سب نے شکریہ ادا کیا اور سیدھے محنت پسند خردمند کے سراغ پر آئے۔ دامنِ کوہ میں دیکھا کہ ایک جوان، قوی ہیکل کھڑا ہے۔ چہرہ اس کا ہوا سے جھریا ہوا، دھوپ سے تمتمایا ہوا، مشقت کی ریاضت سے بدن اینٹھا ہوا، پسلیاں ابھری ہوئی، ایک ہاتھ میں کچھ کھیتی کا سامان اور ایک ہاتھ میں معماری کے اوزار لیے ہانپ رہا ہے، اور ایسا معلوم ہوا کہ ابھی ایک

برج کی عمارت[1] کی بنیاد ڈالی ہے۔ سب نے جھک کر سلام کیا اور ساری داستان اپنی مصیبت کی سنائی۔

وہ انھیں دیکھتے ہی ہنسا اور ایک قہقہہ مار کر پکارا کہ آؤ انسانو! نادانو! آرام کے بندو! آؤ آؤ! آج سے تم ہمارے سپرد ہوئے۔ اب تمھاری خوشی کی اُمید اور بچاؤ کی راہ اگر ہے تو ہمارے ہاتھ ہے۔ خسرو آرام ایک کمزور، کام چور، بے ہمت، کم حوصلہ، بھولا بھالا، سب کے منہ کا نولا تھا؛ نہ تمھیں سنبھال سکا؛ نہ مصیبت سے نکال سکا، بیماری اور قحط سالی کا ایک ریلا بھی نہ ٹال سکا، پہلے ہی حملے میں تمھیں چھوڑ دیا اور ایسا بھاگا کہ پھر مڑ کر نہ دیکھا۔ سلطنت کو ہاتھ سے کھویا اور تم کو منجدھار میں ڈبویا۔ آج سے تم ہماری خدمت میں حاضر رہو اور ہماری آواز پر آیا کرو۔ ہم تمھیں ایسی ایسی تدبیریں سکھائیں گے، جس سے یہ شوریت زمین کی دور ہو جائے گی، ہوا کی شدت اعتدال پائے گی، گرمی سے سردی کی خوراک نکل آئے گی۔ تمھارے لیے پانی سے مچھلی، ہوا سے پرندے، جنگل سے چرندے نکالیں گے۔ زمین کا پیٹ چاک کر ڈالیں گے اور پہاڑوں کی انتڑیاں تک نکال لیں گے۔ ایسے ایسے دھات اور جواہرات دیں گے کہ تمھارے خزانوں کے لیے دولت ہو، ہاتھوں میں طاقت ہو اور بدن کی حفاظت ہو۔ زبردست حیوانوں کے شکار کرو گے اور ان کے آزاروں سے محفوظ رہو گے۔ جنگل کے جنگل کاٹ ڈالو گے، پہاڑ کے پہاڑ اُکھاڑو گے۔ تم دیکھنا، میں زمانے کو وابستہ تدبیر اور تمام عالم کو اپنے ڈھب پر تسخیر کروں گا۔ غرض ان باتوں سے سب کے دلوں کو لبھالیا۔ وہ بھی سمجھے کہ محنت پسند خردمند بنی آدم کا خیر خواہ اور ہمارا اولی دوست ہے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ اس کے پاؤں پر گرے۔ ہمت اور تحمل اس کے پہلو میں کھڑے تھے، اسی وقت انھیں جماعت مذکور پر افسر کر دیا۔

اے حضرتِ انسان! قدرتی گل زاروں کی بہار تو دیکھ چکے، اب اپنی دست کاریوں کی گل کاری دیکھو:

الغرض ہمت اور تحمل ان سب کو جنگلوں اور پہاڑوں میں لے گئے۔ کانوں کا کھودنا، اُتار چڑھاؤ کا ہموار کرنا، تالابوں سے پانی سینچنا، دریاؤں کی دھاروں کا رُخ پھیرنا، سب سکھایا۔ لوگوں کے دلوں پر اس کی بات کا ایسا اثر ہوا تھا کہ سب دفعتہً کمریں باندھ، آنکھیں بند کر، دیمک

کی طرح روئے زمین کو لپٹ گئے۔

عالم صورت چند روز میں رنگ نکال لایا مگر نئے ڈھنگ سے، یعنی ساری زمین، شہر قصبوں اور گاؤوں سے بھر گئی۔ کھیت اناج سے اور باغ میووں سے مالا مال ہو گئے۔ شہروں میں بازار لگ گئے، عمارتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، گھر آباد ہو گئے۔ جدھر دیکھو، ڈالیوں اور گلزاروں میں میوے دھرے، دسترخوان گھروں میں سجے، ذخیرے غلوں سے بھرے؛ کیا گھر کیا باہر، اس کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ غرض محنت پسند خردمند نے اس فرماں بردار رعیت کی بدولت یہ کامیابیاں اور فتوحات نمایاں حاصل کر کے سلطان محنت پسند کا لقب حاصل کیا، اور جابجا ملک اور شہر قائم کر کے اپنی سلطنت جمائی۔

اے محنت کشو! محنت کی بھی ایک حد ہے، آخر ایسا تھکو گے کہ گر پڑو گے:

سلطان محنت پسند اپنے ملک میں ہمیشہ دورہ کرتا رہتا تھا۔ اتفاقاً اس کی سواری ایک کوہستان میں گزری۔ وہاں میووں کی بہتات، پانی کے چشمے جیسے آب حیات، ہرے ہرے سبزے، درختوں کے سائے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، خوب صورت خوب صورت جانور کلیلیں کر رہے تھے۔ یہ جگہ بہت بھائی، چاہا کہ کوئی دم ٹھہرے اور دم لے۔ اتفاقاً وہاں ایسی ایک قوم سے سامنا ہو گیا، جن کی کثرت وانبوہ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا، مگر سب کے سب ضعف وناطاقتی سے زمین میں بچھے جاتے تھے۔ ان میں تھکن اور سستی کی وبا پھیلی ہوئی تھی، اور ناتوانی ان پر سردار تھی؛ صورت اس کی یہ کہ آنکھیں بیٹھی ہوئی، چہرہ مرجھایا ہوا، رنگ زرد، منہ پر جھریاں پڑی، کمر جھکی گوشت بدن کا خشک، ہڈیاں نکلی ہوئی۔ غرض دیکھا کہ سب ہانپتے کانپتے روتے بسورتے، آہ آہ کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کی آوازیں ہی سن سن کر لوگوں کے دل مردہ اور جی افسردہ ہوئے جاتے تھے۔

تحمل اور ہمت کو جوں ہی ان کی صورت نظر آئی، دفعتہً غش کھا کر گر پڑے۔ اس جنگل کی ہوا میں عجیب تاثیر تھی کہ بھلے چنگے آدمیوں کے جی چھوٹے جاتے تھے اور حوصلے پست ہوئے جاتے تھے۔ سب کے ہتھیار، اوزار ہاتھوں سے چھوٹ پڑے۔ بہتیرا دلوں کو سنبھالتے تھے مگر دل قابو میں نہ آتے تھے۔ اس حال کو دیکھ کر سب کی عقلیں جاتی رہیں، اور پھر نئے سرے سے اپنے حال پر افسوس کرنے لگے کہ ہائے ملک فراغ کو کیوں چھوڑا اور خسرو آرام کی اطاعت سے کیوں منہ

موڑا۔ آپس میں صلاح کی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر مصلحت یہ ٹھہری کہ چلو پھر اپنے قدیمی بادشاہ خسرو آرام کی خدمت میں چل کر سلام کرو اور باقی زندگی جس طرح ہو، اس کی اطاعت میں بسر کر دو۔

جو آسایش کے قدرتی سامان تھے وہ اپنے ہاتھوں کھوئے، اب محنت کے بنائے ہوئے سامانوں سے آرام چاہتے ہو؟ نہ ہوگا نہ ہوگا:

خسرو آرام بھی دنیا کے پردے سے اُٹھ نہ گیا تھا، ایک پل میں اس کے پاس جا پہنچے۔ عذرِ تقصیر میں عرض کیا کہ جو کچھ ہم نے محنت کی، مدد سے حاصل کیا ہے، وہ سب نذر ہے۔ ہمیں حضور اطاعت میں قبول فرمائیں۔ یہاں خسرو آرام نے بھی اب دربار کا آئین کچھ اور کر دیا تھا۔ تکلف، آرایش، بناؤ سنگار، عیش و آرام، بہت سے لوگ رکن دربار ہو گئے تھے۔ قدرتی سبزہ زار اور خدائی مرغزاروں کو چھوڑ کر محلوں میں جا بیٹھا تھا، بالا خانوں اور دیوان خانوں میں رہتا تھا، خانہ باغوں کی روشوں پر گل گشت کرتا تھا، جاڑوں میں نرم نرم بستر اور گرم گرم مکانوں میں سوتا تھا۔ گرمیوں میں تکلف کے تہہ خانوں میں بیٹھتا اور بناوٹ کے فوارے سامنے چھٹا کرتے۔ باوجود اس کے کوئی نعمت مزہ نہ دیتی تھی اور کوئی غذا انگ نہ لگتی تھی۔ سب کچھ موجود تھا مگر خاطر خواہ خوشی ایک بات سے بھی حاصل نہ ہوتی تھی۔ غرض ملکِ فراغ میں، جو اس کے انتظام اور آزادی کا لطف تھا، وہ نہ رہا تھا۔ کیوں کہ سلطانِ محنت پسند کے زیرِ حکم رہ کر لوگ خالی بیٹھنے سے بھی گھبراتے تھے اور جسے خوش حالی اور فارغ البالی کہتے ہیں، وہ کسی طرح حاصل نہ ہوتی تھی۔

آرام کے بندو! دیکھو، بہت آرام بہت سی خرابیاں پیدا کرتا ہے:

آرام شاہ کے وزیرِ اعظم عیش اور نشاط نام دو شخص ہوئے تھے، مگر عیش نے دغا کی، کیوں کہ مرض ایک بڑا غنیم سلطنت کا تھا، وہ مدت سے ملک آرام کے درپے تھے۔ چناں چہ مرض نے عیش سے سازش کی اور ایک رات یکا یک قلعۂ جسم پر کمند ڈال کر شبستانِ شاہی میں آن پہنچا۔ جب مرض آیا تو آرام کجا، آرام نے دشمن کو بلائے ناگہانی کی طرح سر پر دیکھا، گھبرا گیا اور ناچار بھاگنا پڑا۔

ان دونوں نمک حراموں نے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور عیش و نشاط کی بدولت تمام عالمِ اجسام

امراض اور بیماریوں میں مبتلا ہوگیا۔ مرض کے سوا کئی اندرونی مفسد اور بھی سلطنت کے بدخواہ تھے۔ چناں چہ ایک سیری[۱] تھی، دوسرے اُکتاہٹ۔ وہ بھی ملک کے دعوے سے ملکہ بننا چاہتی تھیں۔ دیکھنے کو بڑا سا پیٹ، بہت پھولا تا تھا، لیکن حقیقت میں کچھ نہیں، فقط پھونس کا پھولا تھا انھیں کوئی چیز مزہ ہی نہ دیتی تھی، اور ہمیشہ ہر چیز سے دل بے زار اور جی بھرا رہتا تھا۔ ان کی مصاحبت میں ایک بد دماغی اور دوسری بے زاری تھی کہ آٹھ پہر منہ بنائے اور تیوری چڑھائے الگ کرسی پر بیٹھی رہتی تھیں۔ جو نعمت انھیں ملتی شکر یے کا حق خفگی اور بدمزاجی کے ہاتھوں ادا ہوتا۔ ملکۂ مذکور کی نگاہ میں یہ تاثیر تھی کہ ایک نظر میں ساری دنیا کی نعمتیں خاک میں مل جاتی تھیں۔ کیسی ہی سہانی خوشبوئیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، ہرے ہرے سبزہ زار بہار پر ہوتے، مگر جب اس کے سامنے آتے، سب مٹی ہو جاتے۔ اس سے آرام کا لطف زندگی بالکل نہ رہا اور اس کے سبب سے رعایا کا بھی جی بے زار ہونا شروع ہوا۔

عیش کے بندے جب حد سے زیادہ دق ہوئے تو طبیب کیا خوب ڈھونڈا!! رفتہ رفتہ سب ہم راہی آرام شاہ سے کنارہ کش ہوگئے۔ بعض بے مروّت تو عیش سے گھل مل گئے اور عیش نے بھی وعدہ کیا کہ میرے پاس دو حکیم ہیں، جن کے پانی کی بوند تیزاب اور خاک کی چٹکی اکسیر ہے۔ سیری کی خاک اُڑ جائے گی، ہر ایک چیز مزا دینے لگے گی اور ہر ایک بات کا لطف آئے گا۔ ان حکیموں کا نام حرص و ہوس ہے۔ یہ سن کر بہت لوگ تو عیش کے پھسلاوے میں آ کر حرص کے پیچ میں پھنس گئے، اور جو عاقبت اندیش دانا تھے وہ پھر تدبیر اور مشورے کے پاس پہنچے۔ سارے دکھ سنائے اور جو جو مصیبتیں گزری تھیں، سب کی داستان بیان کی۔ انھوں نے بہت افسوس کیا اور کہا کہ خسرو آرام کی بدولت تم نے بہت آرام کیے، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ کسی کام کے نہ رہے۔ محنت سے اس کا تدارک کیا۔ اس کی تحمیں برداشت نہ ہوئی اور ضعف اور ناتوانی سے فریاد کرنے لگے۔ عیش ونشاط سے تفریح کا بندوبست کیا، اس سے بہت لطف اٹھائے، مگر انھوں نے یہ سلوک کیا کہ امراض کے حوالے کر دیا اور آپ الگ ہوگئے، جس سے سب کی زندگی کا مزہ جاتا رہا، ہم تمھارے معاملے میں حیران ہیں کہ کیا کریں۔ سب نے بہت منت اور التجا کی، آخر ان دونوں کو ساتھ لے کر پھر سلطانِ محنت پسند کے پاس گئے اور خسرو آرام کی طرف سے پیغام سلام

دوستانہ پہنچا کر صلح کی تدبیر کی۔

محنت کش ہزار ہمت کرے مگر کوئی نہ کوئی دشمن اس کے پیچھے بھی لگا ہوا ہے:

جس طرح خسروِ آرام سیری کے ہاتھ سے عاجز آ گیا تھا، اسی طرح سلطان محنت پسند کابلی کے ہاتھ سے تنگ تھے، کیوں کہ وہ ہمیشہ ان کی سرحد پر گھات لگائے بیٹھی رہتی تھی۔ چناں چہ دونوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ باہم اتفاق کر لیں۔

حق یہ ہے کہ آرام کا مزہ بھی محنت بغیر نہیں۔ اب ذرا محنت کا لطف دیکھو:

غرض تدبیر اور مشورے کی صلاح سے دونوں نے متفق ہو کر ملکِ فراغ اور کشورِ راحت کو باہم تقسیم کر لیا۔ محبت پسند خردمند کو دن کی سلطنت ملی اور خسروِ آرام کو رات کی۔ دونوں سلطنتوں میں عہد نامہ ہو کر بنیادِ محبت کے استحکام کے لیے بندوبست ہونے لگے۔ چندروز کے بعد مشورت کی وکالت سے یہ تجویز ٹھہری کہ خسروِ آرام کی شادی سلطان محنت پسند کے خاندان میں ہو جائے۔ محنت پسند نے کہا کہ آپ کے اہلِ دربار میں بعض اشخاص سلطنت کے خلافِ مصلحت ہیں، اس واسطے جب تک آپ انھیں خارج نہ کریں گے، مجھے یہ امر منظور نہیں۔ خسروِ آرام نے کہا کہ جس کو تم کہو، اسی وقت جلا وطن کر دوں۔ چناں چہ مشورت وغیرہ مشیروں کی صلاح سے راحت، تکلف، بناؤ سنگار وغیرہ سب نکالے گئے۔ ایک دن رسم شادی کہ وہ بھی سیدھی سادی تھی، سرانجام ہوگئی اور دونوں سرکاروں کا انتظام ایک ہوگیا۔

جب آرام و محنت دونوں اعتدال سے ہوں تو کیوں صحت حاصل نہ ہو:

اتفاق کو خدا نے بڑی برکت دی ہے؛ چندروز کے بعد خسروِ آرام کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام صحت شاہ رکھا گیا۔ بڑی خوشیاں ہوئیں۔ دونوں طرف رسوم مبارک بادی کی ادا ہوئیں۔ گنہگارانِ سلطنت، یعنی نشاط اور عیش کی خطائیں بھی اس خداداد خوشی کے شکرانے میں معاف ہوئیں، مگر اس شرط پر کہ بے طلب سامنے نہ آنے پائیں، نہ بے تقریب بلائے جائیں۔ غرض صحت شہزادہ، بی سلامت خاتون کا دودھ پیتا تھا، خواجہ پرہیز اسے پرورش کرتے تھے، انھی کی تعلیم و تربیت میں بڑا ہوا۔ چوں کہ دو گھروں میں ایک چراغ تھا، خسروِ آرام اور سلطان محنت پسند

دونوں آنکھوں کا نور سمجھتے تھے۔ صحت شہزادہ بھی دونوں بزرگوں کی برابر اطاعت اور دونوں سلطنتوں کی برابر رعایت رکھتا تھا۔ اتفاق کی برکت سے خدانے دونوں گھر روشن اور سلطنت آباد کی اور خدا کے بندوں کو بھی آئے دن کی مصیبتوں سے نجات دی۔

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

عہدِ قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے؛ شہ سواری، تیراندازی اور راست بازی۔ شہ سواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی، مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہوجاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آ کر اُن کے دلوں پر شیشہ جادو مارتا تھا تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بُری جگہ ہے۔ چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشتِ خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہوتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے، ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے، جب لقمۂ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں، جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے، جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لیے سننے والے بھی ضرور ہیں، کیوں کہ خوشامد، جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں؛ اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اُس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابع دار، اُمید کا بھوکا، آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست، محبت کا بندہ ہے، اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں، نہ ڈرپوک ہیں، انھیں باتوں ہی باتوں میں خوش کر دینے کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمودیے گدھوں کے دعوے، بُل ڈاگ[1] کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں، جنھیں کچھ اُمید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے، غرض چاروناچار کبھی ان کے ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عمل داری دُور دُور تک پھیل گئی ہے، بل کہ جن صاحب تمیزوں کو قوتِ عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی اور خود اس مردار سے متنفر ہیں، وہ بھی اس کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے، مگر پھر لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چناں چہ جب کسی شے پر دل آ جاتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرتِ انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا اس کو جاننا بھی نہیں چاہتے، جو بات پسند نہیں آتی، اس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔ اس کان سنتے ہیں اُس کان سے نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں اُسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں، تا کہ لوگ اُسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکۂ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی، جو کہ ملکۂ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکۂ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اوّل تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدقِ دل سے تعریف کی۔ عزت و دوام کا تاجِ مرصّع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ "جاؤ، اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔" عالمِ سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلۂ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگر چہ اُسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے، تو اُن کی سنگت میں وہ بھی آ جاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا، اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اُسے ملبوسِ خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطانِ آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اُسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چناں چہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعوے دار نئے ملک اور نئی رعیّت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے، تو چوں کہ بزرگانِ آسمانی

کو اُن کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی، سب کی آنکھیں اُدھر لگ گئیں کہ دیکھیں اُن کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور وطاقت کو کون نہیں جانتا۔ چناں چہ ملکۂ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے، اُٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اُٹھی، اسی واسطے بلند اُٹھی، اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح واقبال نور کا غبار اُڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے ادراک پر پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے، شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا، اگر چہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اُٹھتا تھا دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتے سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا، تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں، اور چوں کہ یہاں کی مدد کا محتاج تھا، اسی لالچ کا مارا، کمزور، تابع داروں کی طرح ان کے حکم اُٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں اور کام بھی اُلٹ پلٹ، بے اوسان تھے، کیوں کہ استقلال اودھر نہ تھا، اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا، مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا و ہوس اُس کے یار وفادار تھے، اور اگر کچھ تھے، تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آ پڑتی تھی، اُس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پر بادل کا دھواں دھار گپڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف و گزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ داہنے ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس داہنے بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی، بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے؛ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا، اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا، مگر وہ بھی بادِ ہوائی، اٹکل پچو بے ٹھکانے ہوتے

تھے۔ خود ایک پر ند ٹھہر تا تھا، دم بدم جگہ بدلتا تھا، کیوں کہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سرہوتا تھا تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگر چہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی، مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتح یاب ہوتی تھی، تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک، بے حیائی کی ڈھال منہ پر لے، ہواو ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھر برا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکۂ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی، مگر سانچ کو آنچ نہیں۔ زخم جلد بھر آتے تھے اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے، مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کرلیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں، اس لیے دھوکہ بازی اور شعبدہ کاری کا حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لیے ایک سڑک تیار کرو، مگر اس طرح کہ اینچ پینچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہ راہ صداقت، جو خطِ مستقیم میں ہے، اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چناں چہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا، تو اسی راستے سے جدھر چاہتا تھا، نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا تھا، پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اس نے ساری دنیا پر حملے کرنے شروع کردیے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا، ہواو ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے، اور جب ملکہ کا لشکر آتا تو گھاتوں سے مقابلہ کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی، سب اپنی کمریں اُس میں جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے، مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کر کے ہٹتے تھے پھر ادھر ملکہ نے منہ پھیرا، ادھر باغی ہو گئے۔

ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی تو سمجھی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے جو بات سنیں گے اُسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی، مگر یہاں دیکھا کہ گزارا بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہواو ہوس کے غلام ہیں اور

اس میں شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی، مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بدعملی ہوگئی، کیوں کہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا، دشمن کے زیرِ علم جا موجود ہوتی تھی۔

ہر چند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی، کیوں کہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا، مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلے پر دیکھتی تھی اور اس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری اور بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی، تو گھٹتی تھی اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے نا اُمید ہوئی تو غصے ہو کر اپنے باپ سلطانِ آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں، انھی میں رہا کریں، اپنے کیے کی سزا آپ پالیں گے۔ سلطانِ آسمانی اگر چہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا، مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا، تو جہان اندھیر اور تمام عالم تہہ و بالا ہو جائے گا، چناں چہ اس خیال سے اس کی عرضی نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بداصلوں کے ہاتھوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اُسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی، اُن میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے:

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں روائی دنیا میں ہر دل عزیز نہیں؟

(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اُس کے آئینِ حکومت کو جلد اہلِ عالم میں رسائی ہو، اور اُسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو؟

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدرِ انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعووں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے، جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اُٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور صلاحِ وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس

اسے چاہیے کہ جس طرح ہو سکے، اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا، لوگ اُس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے، کیوں کہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے برخلاف ہے۔ اوّل تو اُس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اُس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں اُنھیں سوائے عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیا ہے، جو صورت سب کو بھائے وہی روپ بھر لیتا ہے، اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ اہلِ انجمن نے صلاح کر کے ملک کے طرز لباس کو بدلنے کی تجویز کی، چناں چہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا، جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا اور وہ پہن کو لوگوں کو جُل دیا کرتا تھا۔ اس جامے کا ''مصلحت زمانہ'' نام ہوا۔ چناں چہ اس خلعت کو زیبِ بدن کر کے ملک بہ ملک گیری کو اُٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو راستہ مانگتی، ہوا و ہوس حاکم وہاں کے اُسے دروغ شاہ دیو زاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ اِدھر اس کا دخل ہوا، اُدھر اور اک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامے کے اُترتے ہی اس کی اصلی روشنی اور ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔

چناں چہ اب یہی وقت آ گیا ہے، یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیز کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے، مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیلِ لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے، تو وہ لفافہ اُتار کر پھینک دیتا ہے، پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

گلشنِ اُمید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع واقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں، مگر یہ زمین جس قدر تخمِ اُمید کو پرورش کرتی ہے، اس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی۔ اور اَور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کر اُٹھتی ہیں، یا بمقتضائے سِن خاص خاص عمروں میں اُن کے اثر ظاہر ہوتے ہیں، مگر اُمید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالتِ موجودہ ہماری کچھ خوش حال یا بدحال بھی ہو سکتی ہے، اُسی وقت سے اس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ اُمید ایک رفیق ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے، دم بہ دم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینے کو پھیلاتا ہے، خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کام یابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوش حالی کا باغ پیشِ نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدائی کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں، پھر بھی یہ جادو نگار مصوّر ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے، جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائے گی تو ساری ہوسیں پوری ہو جائیں گی، اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائے گا۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اُمید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے۔ مفلسی، بیماری، قید، مسافرت، بہت سے دنیا کے دکھ درد ہیں کہ اُمید نہ ہوتو ہرگز نہ جھیلے جائیں۔ آسا بھی نرا سامرے۔ یہ نعمت جو بظاہر ہرکس و ناکس میں عام ہو رہی ہے، وہ ضروری شے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں۔ اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو ایک دم گزارنا مشکل ہو جائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے:

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا نا گوار
پر اُمیدِ وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

اس میں بھی شک نہیں کہ اُمید دھوکے بہت دیتی ہے، اور ان باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہوسکتیں، مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزہ دیتے ہیں، اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملے میں ناکام بھی کرتی ہے تو اسے ناکامی نہیں کہتی، بل کہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اس سے بھی اعلا یقین سامنے حاضر کر دیتی ہے۔

میں ایک رات انھی خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے، جس سے اپنے تئیں آپ دھوکہ دیتا ہے، اور زمانہ آیندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لیے اُمید وبیم اور نفع ونقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے؟ کیا یک آنکھ لگ گئی، دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغِ نو بہار میں ہوں، جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ اُمید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے، تمام عالم رنگین و شاداب ہے، ہر چمن رنگ روپ کی دھوپ سے چمکتا، خوش بو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمینِ فصلِ بہار کی طرح گلہائے گونا گوں سے بوقلموں ہو رہی ہے، اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتاپا محو ہو گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دل کشا کو نظرِ غور سے دیکھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف[1] زیادہ ہو۔

پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے چٹکیلے پھول کھلے ہیں۔ آبِ زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے، یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوش بو سے مہک پھیلاتے ہیں، مگر پھر یہاں سے جو نظر اُٹھائی تو اور ہی طلسمات نظر آیا، یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں ان کے تیار میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا۔ چناں چہ قدم اُٹھایا، مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا زیادہ حیران ہوتا گیا، کیوں کہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی، پاس پہنچ کر اُس کی رنگت پھیکی پڑ گئی اور میوے تو گر ہی چکے تھے[2]۔ بلبلیں جو چہچے بھر رہی

تھیں، وہ آگے آگے اُڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچاتھا اور جو بہاریں تھیں، وہ ہر قدم پر سامنے ہی تھیں، مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں۔ گویا میرے شوقِ آرزو کو ڈہکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دم بہ دم غمگین ہوتے ہوتے میں دق ہو گیا تھا، مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا کہ چلے چلو، جو نعمتیں ڈہکا رہی ہیں، کبھی نہ کبھی ہاتھ بھی آ ئیں گی۔ آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا کہ جس میں زن و مرد، خورد و کلاں بہت سے آدمی اُچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں، یا کسی نشاطِ عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہر ایک کے منہ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا، اور ایک ایک آنکھ سرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کی کچھ ایک خاص قسم کی ہے کہ وہ اسی کے دل میں ہے۔ سب ملے جلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے، مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا، نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا تھا۔ بہت لوگوں کی گرمیِ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزو مند، شوق کی پیاس سے تڑپتا ہوتو اُنھیں اُس کے بجھانے کی بھی فرصت نہیں۔ اس واسطے اُن کے روکنے کو جی نہ چاہا اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھا کیا۔ آخر ایک بڈھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انھی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا مگر کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ بڈھے کو اب کیا ہوس ہو گی، اُسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چناں چہ اُسے سلام کیا۔ بڈھے نے تیوری بدل کر منہ پھیر لیا اور کہا "صاحب! دق نہ کیجیے، آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فارغ البالی سے مالا مال ہو جائے گا۔ افلاس زدہ اور طالب روز گار، بیچارے ٹیکس اور محصولوں کے مارے آئے دن کی جاں کنی سے خلاص ہو جائیں گے، بل کہ فلک کے بیسرغ جواہلِ عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں، وہ بھی بازو ڈال، آرام سے بیٹھ جائیں گے"۔ میں نے بڈھے کو اس کی خشکیِ دماغ کے حوالے کیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا جس کی ملائمتِ شکل اور آہستگیِ رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید یہ کچھ اخلاق سے پیش آئے، مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو اُس نے جھک کر ایک سلام کیا اور کہا "اگر آپ کی

خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا، مگر اب اس خوشی کا ہوش نہیں، کیوں کہ بیس برس سے میں ایک عہدے کی اُمیدواری کر رہا تھا، اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے۔" میں نے اُسے بھی چھوڑا اور ایک اور کو جالیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے، کیوں کہ اس کی بیماری کی خبر سنے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا آتا ہے۔ اس نے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی، اس کے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا، یعنی اگر کچھ اور نہ ہوتا ایجاد کا انعام ہی ہاتھ آجائے۔

ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے اور سرکارِ علم سے انعام کا اُمیدوار ہے۔

جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے، اب جو اپنی آنکھ کہے وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو اور آپ دیکھو، کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین، بے پروا سا نظر آیا۔ وہ آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہیے۔ چناں چہ معمولی سوال کا سبق اسے بھی سنایا۔ وہ ہنسا اور کہا: "صاحب! جہاں آپ کھڑے ہیں، یہ ملکۂ اُمید کا باغ ہے؛ وہ ملکۂ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو! بہت سی پریاں خوش نما اور نفیس نفیس چیزیں لیے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور شور مچاتے دیکھا یہ انھی کے اشارے پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھوں تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوانِ عالی شان ہے اور اس کے صدر میں ایک پری، جس کا گل زار جوانی عین بہار پر ہے، سرِ تخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اس کے زیرِ لب، پارے کی طرح لوٹتی ہے۔ لعل و جواہر، تاج مرصع، موتیوں کے ہار، خلعتِ زرنگار، کشتیوں میں چنے آگے دھرے ہیں۔ قسمت اور نصیب جہان کی نعمتیں سجائے اس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں اور بہارِ زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے۔ عیشِ مدام اور فرصتِ دوام سے چہرہ روشن ہے۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے، اور اسی بھروسے پر ہر ایک فخر و ناز کے مارے پھُولا نہیں سماتا۔ رستے کے دونوں طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست اور

بے حقیقت تھی، مگر ہرے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ دیواریں لپی ہوئی، دروازے پر روشن حرفوں میں لکھا تھا "قناعت کا آرام گھر"۔ بعضے تھکے ماندے اُن میں چلے جاتے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتے۔ رستے والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور ہمت کے میدان ہار گئے۔

باغِ اُمید کے دو دروازے:

یہ دیکھ کر میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہنچ سکتی تھی اور اس جمگھٹ کے بھی ایک ایک آدمی کا حال خوب خیال میں آتا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ باغِ اُمید کے اندر جانے کے دو دروازے ہیں، ایک داروغۂ دانش کے اختیار میں ہے، دوسرا داروغۂ خیال کے تحت میں ہے۔ داروغۂ دانش ایک تند مزاج اور وسواسی شخص ہے کہ جب تک بہت سے سوال اور اُلٹی سیدھی حجتیں نہیں کر لیتا، تب تک قفل کی کنجی کو جنبش نہیں دیتا، مگر داروغۂ خیال خلیق اور ملنسار شخص ہے۔ وہ اپنا دروازہ کھلا ہی رکھتا ہے، بلکہ جو اس کی حد میں جائے، اُس سے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ پیش آتا ہے۔ چناں چہ جو لوگ داروغۂ دانش کی حجتوں سے گھبراتے تھے، یا جنھیں اس نے جانے نہیں دیا تھا، ان لوگوں کی بھیڑ اس کے دروازے پر لگ رہی تھی۔ داروغۂ دانش کے دروازے سے ملکہ کی تخت گاہ خاص کو رستہ جاتا تھا، مگر اس راہ کی زمین پھسلنی، سڑک پتھریلی، رستے ایسے اینچ پیچ کے تھے کہ کٹھن گھاٹی اسی کو کہتے ہیں، جب کسی قسمت والے کو داروغے سے اجازت مل جاتی تھی تو اس کی کٹھن گھاٹی میں دکھ بھرنے پڑتے تھے، اگر چہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستے کے اینچ پیچ اچھی طرح جانچ لیتے تھے، اور جو جو بچاؤ کے مقام تھے، اُن میں قدم قدم پر نشان کر لیتے تھے، مگر پھر بھی اکثر ایسی مشکلیں پیش آتی تھیں، جن کا سان وگمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بل کہ جہاں صاف سیدھا رستہ سمجھے ہوئے تھے، وہاں کچھ ایسا تہلکہ پیش آتا تھا کہ یکا یک تھم جانا پڑتا تھا۔ ہزاروں الجھاووں میں اُلجھتے تھے، صدہا رپٹوں میں رپٹتے تھے، بہتیرے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے تھے، اکثر خس پوش گڑھوں میں جا پڑتے تھے۔ غرض ایسی ایسی خطرناک وارداتیں اور ناکامی کے صدمے تھے کہ بہت آدمی تو پہلے ہی دھاوے میں اُلٹے پھر آتے تھے، بہتیرے رستے میں غش کھا کر رہ جاتے تھے، بعض بعض ایسے بھی تھے کہ اُن کی استقلال سے راہ تھی، وہ اس کی دست گیری سے ملکہ کے ایوان تک جا پہنچتے تھے۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے تھے جو صلے کو دیکھ کر پچھتاتے تھے کہ ہائے ہماری محنت تو اس سے بہت زیادہ تھی، یہ تو کامیابی نہیں ہوئی حق تلفی

ہوئی ہے۔ باقی جو لوگ اخیر انعام لے کر پھرتے تھے، ان کا انجام یہ ہوتا تھا کہ دانائی داروغۂ دانش کی بی بی کی مصاحب تھی، وہ اُن کا ہاتھ پکڑتی تھی، اس رہ نمائی سے وہ لوگ گوشۂ قناعت میں جا بیٹھتے تھے۔

اے راہِ اُمید کے مسافرو! چوں کہ داروغۂ دانش کی حجتیں اور اُن کے رستے کی مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں اس لیے میں نے داروغۂ خیال کی طرف رخ کیا۔ یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی، مگر ملکہ صاف سامنے کھڑی تھی۔ وہ یہاں سے سرتاپا ساری نظر آتی تھی اور اپنی عجائب وغرائب، نایاب اور بیش قیمت چیزوں پر سب کو برابر حسنِ طلب کے انداز دکھاتی تھی۔ پھر بھی لطف یہ تھا کہ ایک ایک دل کو اپنی ہوا میں جدا جدا انداز سے اڑا رہی تھی، جس سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو نگاہ مجھ پر ہے وہ کسی پر نہیں اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی کی اُمید نہیں۔ اس واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا۔ پہاڑ اس خیالی رستے کی طرف سے ایسا ڈھلوان تھا کہ قدم نہ ٹھہر سکتا تھا، کیوں کہ وہمی باتوں میں پائداری کہاں؟ باوجود اس کے آمد و رفت کے نشان بہت کثرت سے تھے، کیوں کہ اس راستے میں چلنے والے بہت ہیں۔ اس کی سڑک سایہ دار درختوں سے ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کو جانا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا۔ ساتھ ہی اس کے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو رستہ میں نے پایا ہے وہ کسی کے ہاتھ ہی نہیں آیا۔

یہ بلانصیب لوگ بہتیرے جتن کر رہے تھے۔ بعضے تو ایسے کلدار پر لگانے کی فکر میں تھے کہ جن کی حرکت تھے ہی نہیں بعض کہتے تھے ''جو ہو سو ہو، انھی قدموں میں چلے جاؤ، بلا سے مرجاؤ''۔ یہ سب حکمتیں کرتے تھے، اُس پر بھی زمین سے اُٹھ نہیں سکتے تھے، اور اُٹھے بھی تو ہیں گر پڑے مگر یہاں پڑے تھے، تاک اُدھر ہی لگی تھی اور اس حال تھا پر خود پسندی کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ سامنے عقل کی کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، اُن پر پڑے پڑے ہنستے تھے۔

اکثر خیال کے پیارے اور وہم کے بندے ایسے بھولے بھالے تھے، جنھوں نے اس باغ میں آکر اوروں کی طرح چڑھنے کا بھی ارادہ نہ کیا تھا، یوں ہی ایک جگہ پڑ رہے تھے۔ یہ مقام کاہل گھاٹی کہلاتا تھا اور ایک سنسان اور بے آزار موقع پر تھا مگر ملکہ یہاں سے بھی سامنے تھی۔ یہ اس یقین میں خوش پڑے تھے کہ کوئی دم میں وہ خود یہاں آیا چاہتی ہیں۔ اگرچہ اور لوگ ان وہمیوں کو

احمق اور کاہل وجود سمجھتے تھے، مگر انھیں کچھ پرواہ بھی نہ تھی، بل کہ یہ غم غلط لوگ اس دعوے میں خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہم پرنظرِ عنایت ہوگی۔

ان ہی بے پرواؤں میں میں بھی پڑا ابھرتا تھا۔ اُن میں اتنا لطف پایا کہ اگر کوئی بات کرے تو اُس کا جواب دیتے تھے، اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش کرتے تھے۔ اسی خیال میں یکا یک نظر پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو دیو ڈراؤنی صورت، بھیانک مورت اس گھاٹی میں چلے آتے ہیں کہ اُن کو کسی کی خبر نہیں۔ ایک تو میں جانتا تھا کہ عمر ہے مگر دوسرا افلاس تھا۔ ان کے دیکھتے ہی سارے باغ اور چمن آنکھوں میں خاکِ سیاہ ہو گئے اور یہ معلوم ہوا کہ بس عیش و آرام کا خاتمہ ہو گیا۔ دلوں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ لوگ جو ڈر کے مارے چیخیں مار مار کر چلائے تو گویا عالم میں ایک کہرام مچ گیا۔ اسی سے میں بھی چونک پڑا اور دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

سیرِ زندگی

ایک حکیم کا قول ہے کہ "زندگی ایک میلہ ہے" اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں، یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے، اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر یہی ہے[1]۔

جب اس فقرے پر غور کیا اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصوّر کیا تو مجھے انواع واقسام کے خیال گزرے۔ اوّل تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنیٰ ادنیٰ چیز کا محتاج ہے۔ پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلب گار ہوتا ہے، ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے، اس کا عاشقِ زار ہوتا ہے۔

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیرتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے، اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتہً دردِ مصیبت کی فریاد، خوشی کے ولولے، ڈر کی چیخیں، ہواؤں کے زور، پانی کے شور ایسے اُٹھے کہ میں بے اختیار اُچھل پڑا[2]۔ اوّل تو دل بہت حیران ہوا، بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں اور اس غل کا کیا سبب ہے؟۔

ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب کہاں جاتے ہیں، دریائے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی لہر تھی کہ جس میں کشتیوں[3] کی کمزوری سے، کچھ ملاحوں[4] کی غفلت سے، کچھ ان کی بے وقوفی سے، لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے۔ وہ نہر تو ہم اُتر آئے ہیں، اب منجدھار سمندر ہے اور ہم ہیں کبھی طوفان ہے، کبھی گرداب ہے، کبھی موجوں کے تھپیڑے[5] کھا رہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کیے ہیں، جو رستہ بتانے اور پار اُتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے، مگر

حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے نہ ملاح[6] کی فقط خدا کی آس ہے اور بس:

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

یہ سن کر میں نے اِدھر اُدھر غور سے دیکھنا شروع کیا، اور دل نے کہا کہ پہلے نظر اٹھا کر تو دیکھ لو۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک نہر خوش نما گل زار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہم راہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں ظاہرانہ کچھ زور تھا نہ شور تھا، مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا، وہ اسے بلبلے کی طرح بہالے جاتی تھی۔ ان گل زاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں سے شروع[7] ہوتا ہے، یعنی جس نے آنکھ کھولی تھی، اپنے تئیں باغ ہی میں دیکھتا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ اپنی لہر بہر میں بہتا چلا جاتا تھا، اور دھند اتنی چھائی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر بھی کام نہ کرتی تھی[8]۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں ہیں اور جابجا گرداب[9] پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے[10] تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں بادِ مراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے، اور جو بے چارے پیچھے رہ گئے تھے ان پر قہقہے اڑاتے چلے جاتے تھے، مگر یہ بھی ہنستے ہنستے ابھی گردابوں میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا یہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انھی میں ایسے لوگ بھی تھے کہ ناواقفیت[11] و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گردابوں میں ڈال دیتے تھے، اور موجوں کے تھپیڑے انھیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا، اور کشتی کو اس کی ٹکر پر چڑھالانے کا تو کیا ذکر ہے، اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے سے چڑھ آئے، یا کاش کہ جہاں سے چلا تھا پھر دہیں آجائے۔ سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھام سے سنبھالے چلے جاتے تھے، اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطرہ نہیں، اگر ہے تو اور ہم سفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے اور اپنی بدانجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اس مصیبت میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے۔ جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بداعمالی، جو پَر سے پَر ملائے برابر عالمِ ہوا میں اُڑتی چلی جاتی تھیں، وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں۔ ہر شخص[12] خوش ہوتا تھا اور دل میں اپنے تئیں مبارک باد دیتا تھا کہ

الحمد اللہ میری کشتی کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔ جو گرداب اوروں کو نگل گیا، میں اس سے بچ جاؤں گا، اور جن چٹانوں نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا، میں انھیں بھی بے لاگ پھاند جاؤں گا۔ غفلت سے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے، مگر اسی رستے چلے جاتے تھے۔ اس[13] بے پروائی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے تو جو چپّو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہو کر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ سستی اور بے پروائی ان کی کچھ اس لیے نہ تھی کہ ایسی زندگی سے سیر ہو گئے تھے، کیوں کہ جب ڈوبنے لگتے تھے تو سب چلاتے تھے، داد بیداد کرتے تھے اور اپنے اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا کوئی آ آ و اور ہمیں سنبھالو اور اکثر اخیر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں[14] بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حماقتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے، تم بچے رہنا چناں چہ ان کی اس ہمدردی اور محبت پرستی پر بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں، مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے، نہ ان کی نصیحت پر کوئی اور عمل کرتا تھا۔ اِدھر اُدھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے تھے۔ بہت سے مسافروں کی ہڈیاں پڑی تھیں، بہتیرے نیم جان، بہتیرے ایسی بے کسی اور تکلیف کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھانہ جاتا تھا۔ ایک دوسرے کو ان کی مصیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا، مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا۔ جس کشتی[15] پر ہم سوار تھے، حق یہ ہے کہ اس کے جوڑ بند بھی دریائے حیات کی موجوں کے صدمے اٹھانے کے قابل نہ تھے، بل کہ رستے ہی میں ٹوٹتے نظر آتے تھے اور سب ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پھرتی کریں یا زور لگائیں، ڈوبنے سے بچتے نہیں۔

جب ان آفتوں کا باہم چرچا ہوا تو جو جو مست غفلت زندگی کے نشے سے سرخوش بیٹھے تھے، وہ بھی غمگین ہو گئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے اور بزدلے اور نامردوں کو زندگی عذابِ موت ہو گئی، بل کہ رنج و غم کے بعد جن راحتوں کی اُمید ہوتی ہے، اس سے بالکل مایوس ہو گئے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطر[16] تھا، وہی زیادہ تر بے پروا تھے۔ بلکہ سب کا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطر کا خیال دور دور رہے اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئیں گی جو اٹھائی نہ جائیں گی، وہ سامنے نگاہ بھر کے نہ دیکھتے تھے۔ اس وقت کے لیے کچھ نہ کچھ مشغلے نکال لیتے تھے[17]۔ اُمید تو ہمیشہ اس رستے میں ہی رہتی تھی، اس سے ہنس کھیل کر

دل بہلاتے رہتے تھے۔ جن لوگوں کی اُمید سے بہت راہ تھی، اُن سے اس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کر رکھے تھے، مگر اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی، جس کے سہارے سے بھاگ کر تو بچ جاتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اوروں سے کچھ پیچھے ڈوبو گے اور یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدے پر راضی تھے۔ درحقیقت اُمید کی باتیں اُن کے مسخرے پن کے طور پر تھیں، کیوں کہ جتنی اُن کی کشتیاں پرانی ہوتی جاتی تھیں، اُتنی ہی بے خبری کے عہدنامے تازے کرتی تھیں اور تعجب یہ ہے کہ جنھیں ڈوبنے کا یقین تھا وہی کاروبار کے لیے زیادہ کمر کستے تھے۔

دریائے زندگی میں ایک بڑا جزیرہ نظر آیا۔ اس کے کنارے پر دریا سے لگا ہوا ایک بلند منارہ تھا۔ اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا: "بداعتدالیوں کا گل زار"۔ جہاں تک جزیرے کی حد تھی، وہاں تک پہاڑ سی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبت ناک گرداب پڑتے تھے۔ جہاں سے کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور جتنی کھلی تھیں، نہایت سر سبز اور خوش نما تھیں۔

جوانان مرغزار، یعنی ہرے بھرے درخت، ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے جھوم رہے تھے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں۔ وہیں آرام اپنی پلنگڑی بچھائے لیٹا تھا اور خوشی بیٹھے بیٹھے سُروں میں بڑی ایک ترانہ لہرا رہی تھی۔ یہی مقام رہ گزر عام کا تھا، اس لیے جو لوگ ادھر سے گزرتے تھے، یہاں کی سرسبزی ان کی آنکھوں میں ضرور طراوت دیتی تھی۔ ادراک کا ناخدا دا اپنے ہاتھ پر دوربین لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اس سکڑے رستے سے نکال لے جاتا تھا مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی ۱۸ کھینے کے لیے ان سے ڈانڈ مانگتا تھا کہ صحیح سلامت یہاں سے نکال دے۔ یہ اس باغ سبز پر ایسے محو ہو رہے تھے کہ جواب بھی نہ دیتے ۱۹ تھے خواہ وہ خفا ہو کر کہے، خواہ منتوں سے مانگے۔ تھوڑے ہی ہوں گے جو اس کا کہنا بھی مانتے ہوں گے اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی دل خوش کر لیں، اور عہد لے لو کہ بھر رستے بھر ہم کہیں نہ اٹکیں گے۔ نہ سمجھتے تھے کہ برتنا تو در کنار، ان بلاؤں کے پاس نکلنا بھی غضب ہے، چھوڑا اور موا۔

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک چابک دست ان کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہو گیا اور

جزیرۂ مذکور کی طرف لے چلا۔ اس جزیرے نے کشتی کو اس طرح کھینچا جیسے مقناطیس[۲۰] سوئی کو کھینچ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچھتائے اور جتنا زور تھا سب لگا دیا، لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلی۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جان گنوا بیٹھے۔ ہاں جن[۲۱] لوگوں پر ادراک چابک دست کی چالاکی، تدبیر کارگر ہوئی، وہ بچے، مگر بڑے دکھ اُٹھا کر بچے، اور نکلے تو جس طرح پہلے چلے جاتے تھے، اسی طرح موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے طلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی، اور یہ بھی بادِ مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لیے جاتے تھے۔ آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے، اُدھر کشتیِ حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے، مگر جو ڈوبتا تھا، اپنی کوتاہ اندیشی پر بہت پچھتاتا تھا اور اوروں کو نصیحت کرتا جاتا تھا کہ:

؎ من نہ کردم شما حذر بکنید

خبردار! کوئی جزیرۂ بے اعتدالی کے سامنے نہ آنا۔

خدا کی قدرت کہ جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے، ان کے کاری گر بھی وہیں موجود[۲۲] تھے۔ بہت لوگوں کو اپنے کاری گروں پر بڑا بھروسا تھا اور بعض کشتیاں بھی ایسی تھیں کہ انھیں تھوڑا ہی صدمہ پہنچا تھا، مگر معلوم ہوا کہ جنھوں نے تھوڑا صدمہ اُٹھایا تھا، وہ بھی کچھ بہت نہ جیے۔ روز بروز مرض بڑھتا گیا، آخر ڈوب ہی گئے۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ پہلو بچایا[۲۳]۔ مگر بہتیرے کاریگر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا تھے۔

غرض سیرِ زندگی میں چالاک لوگوں نے اگر پایا تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ پیچھے ڈوبے، وہ پہلے ڈوبے۔ بہتیرے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہم راہیوں کے ساتھ چلے آتے تھے، انھیں غوطے کھاتے دیکھتے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے، یعنی بادِ مخالف برابر غرق کیے جاتی تھی۔ نہ ان بے چاروں کو محنت تدبیر کرنی پڑتی تھی، نہ غم انتظار اُٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی ٹکر کھا کر بچ نکلے تھے، وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے بہت لڑے، مگر جو اوروں پر پہلے گزری تھی وہ ان پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا تو یہی ہوا کہ

اُمید کو بھی کنارۂ کامیابی تک پہنچنا مشکل ہے۔ یہ حالت دیکھ کر میرا دل ایسا زندگی سے بےزار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کر کے اس دریا میں کود پڑوں۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت سبز لباس پہنے سامنے کھڑا ہے، اور اپنے عصا سے اشارہ کر کے پاس بلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر پھیرا اور عصا اٹھا کر سامنے اشارہ کیا۔ خدا جانے دور بین الٰہی سے میری آنکھیں روشن کر دیں یا کُہر، جو دھواں دھار ہو رہی تھی، اُسے اپنی برکت سے اُڑا دیا، دیکھوں تو سبحان اللہ! صبح سعادت بے وقت ہے، چمن کے لہلہے مرغانِ سحر کے چہچہے، پھولوں پر شبنم صبا اور نسیم کم کم، جزیرے کے جزیرے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جَمَک جَمَک لہریں مار رہا تھا۔ بڑے بڑے امرا شرفا خلعت ہائے فاخرہ اور زرق برق کے لباس پہنے، پھولوں کے طُرے سر پر، ہار گلے میں ڈالے، ادھر اُدھر درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں، کچھ فواروں کے نیچے حوض میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، کچھ پھولوں کی کیاریوں میں بے تکلف لوٹتے ہیں اور گانا سن رہے ہیں۔ غرض کہ ہجوم بہار اور رسیلی آوازوں کے ستاروں نے وہ جمگھٹ کر رکھا تھا کہ شورِ قیامت بھی آئے تو خبر نہ ہو۔ اس عالم کو دیکھ کر میرا ساغرِ دل خوشی سے چھلک گیا اور بے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آ جائیں تو اُڑوں اور اس باغ فرح بخش میں جا پڑوں، لیکن اس پیر بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں، الا دروازۂ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو۔ دیکھو وہ سرسبز اور رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے ہیں اور سمندر کے قالین پر گل کاری کر رہے ہیں، حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمھاری نظر کام کر سکے بل کہ جہاں تک تمھارا خیال دوڑ سکے، اس سے بھی آگے تک لاانتہا چلے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحب دلوں کے گھر یہی ہوں گے۔ جن جن لذتوں کو دل چاہے اور طبیعت کیفیت اُٹھائے، سب یہاں موجود ہیں۔ ہر جزیرہ باغ جنت کا مکان ہے کہ اپنے اپنے مکین کے لائق سامان ہے۔ کیوں آزاد! کیا یہ مقام اس لائق نہیں کہ جان تک بھی ہو تو دے دیجیے اور انھیں لیجیے؟ کیا اس زندگانی کو مصیبت سمجھنا چاہیے جس کی بدولت یہ

نعمتیں حاصل ہوتی ہیں؟ کیا موت سے ڈرنا چاہیے؟ کیا ملکِ عدم کو خوش ہو کر نہ چلنا چاہیے، جس کی بدولت ایسی ایسی نعمتیں حاصل ہوں؟ نہیں نہیں، ہرگز نہیں اور سنتے ہو! یہ سمجھنا کہ انسان جس کے لیے یہ بے زوال سامان ہیں، اسے یوں ہی پیدا کر دیا ہے؟ دنیا مقامِ امتحان ہے، ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں۔ امتحان کا نام سنتے ہی چونک پڑا، آنکھ کھول کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں، تو جو لوگ آپ اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں، وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالا تر لے گیا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو غنیمت سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا، اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی: خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے رنج والم اور مصائب وتکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چناں چہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اُٹھا رہا تھا، دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے، لیکن جو بوجھ گرتا ہے، مقدار میں اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہا، دُبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا، اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا، جس کا دامن دامنِ قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنّات کی تصویریں زردوزی کڑھی ہوئی تھیں، اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں، تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی، اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتا

دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں، ایک شخص پرانے سے چکن کے جُبے میں ایک بھاری سی گٹھڑی لیے آتا ہے۔ جب وہ گٹھڑی انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا، بدن سے پسینہ بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپتا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی، اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا؛ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دودِ آہ کی گٹھڑیاں تھیں کہ انھی میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزے بالی دیے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح دردسے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے، لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں، کچھ کچھ جد و جہد سے سر ہلا، مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے، اسی طرح چلے گئے۔ بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ کچھ موٹے موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی، مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے، مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبارِ رنج والم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع و اقسام کے سقم اور امراض بھی تھے، جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہمیوں نے خواہ مخواہ انھیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا؛ جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں، ان سب کا مجموعہ تھا۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض نوجوانی اپنے ہاتھوں میں لیے آتے تھے، مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا، اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بد اطواری[1] پڑی ہوئی دکھائی نہ دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعفِ جسمانی اور عیوبِ عقلی سے کوئی

نجات پانی چاہیے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے، بے پروا چلا آتا ہے۔ اس نے بھی ایک گٹھڑی پھینک دی، مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شُہدے آئے؛ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے، مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے، مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چناں چہ اس خیال سے میرے طرف جھکے، ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے، مگر انھوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا، مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ بر خلاف اس کے، بدن اور قد و قامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا، اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا، یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہِ پُر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالمِ ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک کر دیکھ رہے تھے، جو سلطانِ افلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کر لیں، اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے، اور پھر بڑی پُھرت پکھرت کے ساتھ اس انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چناں چہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا، درد قولنج سے جاں بلب تھا، اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے درد مذکور کو پھینک کر ایک خوب صورت نوجوان لڑکے کو لیا، مگر لڑکے کے نابکار و نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس

کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چناں چہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا چناں چہ بڈھے نے کہا کہ برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا لے لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجے بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ پھر نہ ہو سکتا تھا۔

ایک بچارا جہازی غلام تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑے منہ بسور رہا ہے۔

غرض اس طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لی تھی، وہ اس سے ناراض نظر آتا تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اسے چھوڑا تھا، اب وہ درد جگر کا مارا لوٹ رہا تھا، اور اسی طرح برعکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی۔

عورتیں بے چاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا، مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی، مگر چوں کہ سینہ اور بازو بھی دبلے تھے اس لیے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوب صورتی لی تھی، مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہور ہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں، وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بموجب ہوتی ہیں، یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

مجھے اس بڈھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوب صورت بجیلا جوان بن کر چلا، مگر مثانے میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا، کمر جھکی ہوئی، گردن بیٹھی ہوئی

تھی، کھوے سے کھوا چھلتا تھا، مسخرے اوپر نیچے نکل آئے تھے، اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں، ان کا غول گرد تھا، یہ انھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف نہ گزرنا چاہیے۔ چناں چہ اس کی صورتِ حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا، تو اگر چہ میرا ہی چہرہ تھا، مگر میں ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی صورت بھی بگڑ گئی، اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بیچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا۔ مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی، کیوں کہ جب میں اپنی پیشانی سے عرقِ ندامت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے تو ٹانگوں کے مُٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا۔ اس نے ایک لم ٹنگھ سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے۔ سر کا یہ عالم تھا کہ گویا ہوا میں اڑا چلا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمال کوشش سے قدم اُٹھاتا تھا، مگر یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھچے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالتِ غریب کو دیکھ کر کہا کہ "میاں اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سوا دمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں"۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا، مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا، یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہ وافسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان افلاک کو بے کس آدم زاد کے حال دردناک پر رحم آیا اور حکم دیا "اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔" سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر وگردن سے اتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ "وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا، وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس کی جگہ ایک فرشتۂ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات وسکنات نہایت معقول و

باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوش نما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھایا اور رحمتِ الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اسی کی آس پر لگا دیا۔ اس کا نام صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اس کوہِ مصیبت کے پاس آ کر بیٹھا ہی تھا، جو کوہِ مذکور خود بخود دسمٹنا شروع ہوا، یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلث رہ گیا۔ پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا کر دینا شروع کیا، اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اُٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبارِ لاانتہا میں سے اپنا بارِ مصیبت چننا نہ پڑا۔

علوم کی بدنصیبی

تمہید:

تمام صاحب جوہراور کل اہلِ کمال ہمیشہ سے ان نالائقوں اور غلط نما باکمالوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں، جو فلک کی سفلہ پروری یا قسمت کی یاوری سے ہوائے مراد کے بیلون میں بیٹھے ہیں اور ترقیوں کے آسمان پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اس معاملے میں اہلِ علوم سے زیادہ کوئی واجب الرحم نہیں۔ صدیوں کے بُعد تو کوئی صاحبِ صنعت پیدا ہوتا ہے۔ اگر چہ ہر شخص کے کام کی ترقی خاص اور عام کی قدر دانی پر منحصر ہے، لیکن بنیا داس کی حکام یا اہلِ دول کی بدولت قائم ہوتی ہے۔ اسی واسطے اس کی رونقِ بازار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، اور ان خرابیوں کا بیان کرنا حدِ قلم سے باہر ہے۔ اوّل تو اہلِ کمال ہمیشہ کم اور بے کمال انبوہ در انبوہ ہیں۔ ان کی بھیڑ بھاڑ ایسی خاک اُڑاتی ہے کہ ان کے کمال پر خاک پڑ جاتی ہے۔ ناچار دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں جو ثابت قدم رہتے ہیں، ان کی بدنصیبی یہ کہ جن قدر دانوں پر مدار کار ہے، کبھی کثرتِ کار سے، کبھی بے پروائی سے، غرض تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے شوق کو اُن لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں، جو اس کام کے لائق نہیں۔ اس صورت میں اگر قسمت سے ہوا چلی اور خود بخود کسی کی گود میں ثمر مراد آ پڑا تو آ پڑا، نہیں تو ذلت، تباہی اور در بدری کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ان ناگوار باتوں کو غلط نما باکمال گوارا کر لیتے ہیں، مگر اہلِ کمال مرنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں، پھر بھی ناچار گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ سفارشیں اٹھاتے ہیں، در بدر پھرتے ہیں، خوشامدیں کرتے ہیں۔ غرض کہ اس راستے کی

منزلوں میں جو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں، وہ ایک افسانے کے استعارے میں بیان ہوتی ہیں۔

آغازِ مطلب:

علوم وفنون نے دیکھا کہ مدّت گزر گئی، ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادت دلی سے انسان کے فائدوں کے لیے محنت کر رہے ہیں، اور جس صدقِ دل سے جانفشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں، اس کا صلہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ بل کہ جن بے لیاقتوں کو جوہرِ کمال سے کچھ واسطہ نہیں، اور انسان کی نفع رسانی کی کچھ بھی پروا نہیں رکھتے، وہ کام یابی اور عیش وعشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں۔ سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطانِ آسمانی کے دربار میں عرضی کی۔ خلاصہ جس کا یہ کہ انصاف وعدالت کے بموجب تمام مریدانِ خدمت گزار کو بمقتضاے انصاف، عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں۔'' دربار میں مشتری صدرِ اعلا تھا اور عطارد میر منشی۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور اداے خدمت میں مشقتیں تھیں، سب جتائی اور دکھائی گئیں، اور حق تلفیوں کا دعویٰ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت عالمِ خاک میں علوم وفنون کی کوششوں اور کارگزاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہوگئے ہیں کہ یقین ہے چند روز میں دنیا کو چھوڑ کر عالمِ بالا کی طرف چلے آئیں اور اگر وہ دنیا میں نہ رہے تو حضرتِ انسان، جنھوں نے یہ شوکت وشان بنائی ہے، حیوانوں سے بدتر رہ جائیں گے۔ پھل پھلاری، گھاس پات چرتے پھریں گے، جنگلوں کے جانور بن جائیں گے، اور جوئن سے زیادہ وحشی ہوں گے وہ انھیں پھاڑ کھائیں گے۔ اس کے فیصلے کے لیے عالمِ بالا میں کمیٹی ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو ارکین دربار کا رنگ ہوتا ہے، وہی کل دربار کا رنگ ہوتا ہے۔ چناں چہ سب کا اتفاقِ رائے اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہیے۔ ملکۂ کوکب جمال کی بیٹی تھی کہ باپ اس کا عالمِ خاکی سے تھا، مگر اس کے نورِ جمال اور حسنِ کمال نے تمام عالمِ بالا خاکی سے تھا، مگر اس کے نورِ جمال اور حسنِ کمال نے تمام عالمِ بالا کو روشن کر رکھا تھا، اور صداقت وحقیقت کے مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ اسے حضور سے ملکۂ علم افروز کا خطاب عطا ہوا اور عقل کا تاج سر پر رکھا گیا، جس میں آفتاب کی طرح فہم وادراک کی شعاعیں جگمگاتی تھیں۔ رفعت کا تخت پھولوں سے

سجایا۔ اس ملکۂ موصوفہ کو جلوہ گر کر کے اس طرف روانہ کیا۔ آسمان نے تارے اُتارے اور زمین نے بجائے غبار کے نور اڑایا۔ اس نے بھی عالم میں آ کر باپ کی طرف سے وہ شوکت وشان لیاقت کی دکھائی، جس سے تمام بے لیاقت تھرا گئے، اور ماں کی طرف سے وہ روشنی پھیلائی کہ کرۂ خاک نور کی قندیل ہو گیا۔ دن رات دربار جاری تھا۔ علوم کے مسائل اور ان کی تصنیفات کے مقدمات پیش ہوتے تھے۔ استاد، یعنی صداقت کی طرف سے متانت اور خاموشی مصاحبت میں آئی تھی، چناں چہ علوم وفنون جن لوگوں کی سفارش کرتے تھے، وہ ان ہی کے ذریعے آ کر پیش ہوتے تھے۔

عالم بالا کے لوگ علم کے عاشق تھے۔ سب اس کی فرماں روائی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جلوسِ دربار کے لیے ہر طرح کے سامان بھیجے اور بارگاہ شاہی نے عجب شان وشکوہ حاصل کی۔ جب دربار میں آ کر بیٹھتی تو عدل وانصاف کھوٹے کھرے کے پرکھنے کو کھڑے رہتے، اُمید سامنے ناچا کرتی، قدردانی دستِ راست پر کھڑی رہتی، اور سخاوت کے اشارے کے بموجب ہر ایک کو انعام دیتی کہ قسمت کے ہاتھوں لوگوں تک پہنچ جاتے تھے۔

ایک دن ملکۂ علم افروز اپنے رفعت کے تختِ ہوادار پر سوار ہو کر ہوا کھانے نکلی۔ اتفاقاً ایک پہاڑ کی طرف گزر ہوا۔ کوہِ مذکور پر جہالت ایسی چھائی ہوئی تھی کہ دامنِ کوہ سے لے کر چوٹی تک تمام دھواں دھار سے گھٹ رہا تھا۔ اس کے قدم سے سیاہی کے دھوئیں اُڑ گئے اور تمام تاریکی بر طرف ہو گئی۔ یہاں اگر چھاؤں بھی تھی تو نہ بارش کی سیرابی سے، بل کہ گھٹاؤں کے پسینے سے سیل لے رہی تھی۔ اب اس نے اپنی سرسبزی کو ہرا کیا۔ کچھ پھول تھے جو روشنی بغیر ٹھٹھر رہے تھے، وہ بھی چمک کر رنگ نکال لائے غرض ہر شے کی طبیعت اپنی اصلیت پر آ کر شگفتگی کے جوش سے کھل گئی اور خوشبوؤں سے عالم مہک گیا۔

روئے زمین پر بہار کا یہ غلام دیکھ کر سلطانِ آسمانی نے بھی حکم دیا کہ سامنے سے پردے اُٹھا دو۔ عالمِ بالا کے پاک نہادوں نے گل دستے ہاتھوں میں لے لیے اور خوش ہو کر پھول اُچھالنے لگے۔

جب اس پہاڑ کو گلوں سے گل زار اور شادابی سے نو بہار دیکھا تو علمِ تعمیر وہاں آ گیا۔ اپنے

کمال سے ایک محل عالی شان تیار کیا۔ بہار نے کوسوں تک گل زار لگایا، طرح طرح کے اوزار کام میں آئے، سڑکیں نکالیں، اُتار چڑھاؤ درست کیے، ریلیں جاری کیں، جابجا فرودگاہیں اور ان میں مہمان خانے اور آرام خانے بنائے۔ غرض عجائبات و غرائبات سے سجا کر ایسا طلسمات کر دیا کہ جس کے دیکھنے سے آنکھوں کو طراوت اور خیالات کو بلندی و وسعت حاصل ہو، اور تصنیفات میں ایجاد اور مضمون آفرینی کے لیے سامان بہم پہنچیں۔ چناں چہ ملکہ نے یہی سکونت اختیار کی۔ قسمت نے آکر انعاموں کا دروازہ کھول دیا۔ صداقت جانچتی تھی اور عدل بے رو رعایت دیے جاتا تھا۔ یہ دروازہ رات دن کھلا رہتا تھا۔ اُمید دروازے پر بیٹھی رہتی تھی، اور جن کے لیے علوم و فنون سفارش کرتے تھے، انھیں بلا لیتی تھی۔ تمام دربار کثرتِ خلائق سے بھرا رہتا تھا، اور ہر چند اکثر اشخاص ناکام بھی جاتے تھے مگر شکایت کوئی نہ کر سکتا تھا، کیوں کہ خود ملکہ کی آنکھ کسی سے غافل نہ تھی جو لوگ وہاں سے ناکام پھرتے تھے، ان کا نام بھی نالائقوں کی فہرست میں درج ہو جاتا تھا، پھر وہ عالم شہرت سے خارج ہو کر یا تو گم نامی کے گوشے میں بیٹھ جاتے تھے کہ کوئی انھیں پوچھتا نہ تھا یا پیچ در پیچ اور واہیات کاموں پر جھک پڑتے تھے۔ بعض ایسے تھے کہ محنت سے مدد لیتے تھے اور پھر اپنے نقص کی تکمیل میں کوشش کرتے تھے۔

اب اہلِ نظر غباری عینکیں لگالیں کہ بے کمالوں کے دلوں کے غبار آندھی ہو کر اٹھتے ہیں۔ اُن کے اقبال کا دور آیا:

ناکاموں میں اکثر نااہل ایسے بھی تھے کہ نہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوتے تھے، نہ شرمندگی کے گوشے میں بیٹھتے تھے۔ چند روز کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ایک دن سب نے محل کو گھیر لیا اور باغ میں آکر بستر ڈال دیے۔ ہر چند ملکۂ مذکور کو جو ہر افلاک کا تھا، مگر باپ کی طرف سے پیوند خاک کا تھا، اس لیے تجویز میں کچھ نہ کچھ چوک بھی ہوتی تھی اور اگر چہ اس خطا کی اصلاح بھی بہت جلد ہو جاتی تھی، مگر پھر بھی حریف تاک میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں کہیں نہ کہیں موقع گرفت کا ہاتھ لگ ہی گیا۔ چناں چہ انھوں نے کچھ اپنے رفیقوں کے گھروں میں کمیٹیاں شروع کر دیں، اور آپس ہی میں نالش اور اپیل کے سے ڈھنگ ڈال دیے۔ تمام عالم میں رفاہِ عام، رفاہِ عالم اور اصلاح اصلاح کا نام کر کے فریاد مچا دی، جس سے جمعیت بے شمار اکٹھی ہو گئی۔ صبح و شام جمع

ہوتے۔ لمبی لمبی تقریریں کرتے، مگر اس میں مطلب کا نام نہیں، جھوٹ موٹ کی بکواسیں کرتے جنھیں دلیل سے کام نہیں۔ کوئی سرو قد بن کر رائے دیتا، کوئی شمشاد ہو کر رائے شامل کرتا، کوئی تائید کرتا، کوئی تسلیم کرتا، آپ ہی اتفاق رائے کر لیتے، آپ ہی واہ وا کر لیتے۔ اس تودۂ طوفان کو لکھتے اور پروسیڈنگ (روائدا) نام رکھتے تھے، جسے مشتہر کرکے بڑے فخر کیا کرتے۔

ان ناکاموں کی اُمید سے راہ تھی اور بے حیائی ان کی بڑی خیر خواہ تھی۔ چناں چہ وہ ہمیشہ ان کو ملکہ کے دربار کی طرف دھکیلتی رہتی تھی، کہ چلو اور دوبارہ دعوے پیش کرو۔ اگرچہ وہاں سے دھکے کھاتے تھے اور جب جاتے نکالے جاتے تھے، اس پر بھی اُمید کا یہ حال تھا کہ ان کی رفاقت چھوڑتی نہ تھی، اور بے حیائی برابر زور لگائے جاتی تھی۔ غرض ان اندرونی راہوں کے ساتھ انھوں نے ایک اور راستہ نکالا، یعنی خیال کیا کہ یہ جمعیت ہماری جو اُمید کی حمایت اور بے حیائی کی عنایت سے روز افزوں ہے، اس کی کثرت ہمیں ضرور فتح یابی بخشے گی۔ پس جس طرح ہو سکے اپنی بھیڑ بھاڑ کو بڑھانا چاہیے۔

جب پروردگار کسی بندۂ خاص کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے بندوں کے کام اس کے سپرد کرتا ہے، تو خواہ مخواہ کے خیر خواہ مشورت دینے کو بہت پیدا ہو جاتے ہیں مگر ان باتوں میں آ کر حقیقت اور واقعیت کو نہ بھول جانا چاہیے۔ خیال کر کے سنو، یہ خیر خواہ کیسے کیسے ہوتے ہیں:

اِدھر تو بے لیاقت اہلِ فساد نے یہ سامان بہم پہنچائے، اُدھر یہ قدرتی پیچ پڑا کہ ملکہ کو آسمان سے اترے ہوئے مدت ہوئی تھی۔ عالمِ خاک میں آ کر نیت اس کی پستی کی طرف زیادہ مائل ہونے لگی اور عدل وانصاف کی نصیحتیں سب بھول گئیں یا تو صحبت اس کی علوم وفنون سے تھی، یا غرور سے دوستی ہوگئی، آرام اور غفلت کو مصاحبت میں لے لیا اور رفتہ رفتہ غرور سے ایسی رسم وراہ بڑھی کہ اس سے شادی ہو کر دولڑکیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ ایک ان میں سے خوشامد اور دوسری خام خیالی۔ خوشامد نے فیاضی سے فیضِ تعلیم پایا تھا اور خام خیالی نے قسمت سے۔

غرور کے محل میں بی بی خود پسندی بھی تھیں، جن کا اس نے دودھ پیا تھا۔ دوسری دایہ خودرائی

تھی، اس نے پالا تھا۔ ملکہ علم افروز نے یہ غضب کیا کہ ساری خو بو خاوند کی اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ خود رائی کی صلاح سے فیصلے اور خود پسندی کے دستخط سے احکام جاری ہونے لگے۔ صداقت نے جو سبق پڑھائے تھے، سب بھلا دیے، اور عدل تو بیکار ہی ہو گیا۔ جب ان مصاحبوں کے اختیار اور لڑکیوں کی محبت زیادہ ہوئی تو علوم کا زور بالکل گھٹ گیا۔ اس کے رفیق اور قدردان دربار سے بند ہو گئے۔ وہ بے چارے بجھے چراغوں کی طرح طاقتوں میں پڑے رہتے، ملکہ کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ علوم و فنون کے خدمت گزار محنتیں کر کے، راتوں کو صبح اور صبحوں کو رات کرتے۔ برسوں کی دست کاریوں میں اپنے کمال ظاہر کرتے، مگر صلے کے نام خاک بھی نہ پاتے۔ البتہ ان میں بھی جو چالاک ہوتے اور خام خیالی اور خوشامد کی وساطت سے وہاں تک جا پہنچتے، ان کے لیے سب کچھ موجود تھا۔

جب ارکانِ سلطنت کی بے اعتدالیاں حد سے گزر جائیں، تو اہلِ فساد کیوں سر نہ اٹھائیں:

جب دربار کا رنگ اس طرح بے رنگ ہوا، نہ علوم کے قدردان وہاں رہے، نہ فنون کے جوہر شناس، تو چرچے اس کے جابجا پھیلے، اور ان نالائقوں کو بھی خبریں پہنچیں، جن کی علوم سفارش نہ کرتے تھے۔ چناں چہ یہ خبریں سن سن کر ان کے ہاں بڑی خوشیاں ہوتی تھیں۔ وہ ملکہ کے دل سے دشمن و بدخواہ تھے۔ ان باتوں کو اس کے زوالِ دولت کے آثار سمجھ کر اپنی کامیابی کی تدبیروں میں زیادہ سرگرم ہوئے۔ اُدھر ملکہ کے دربار کا یہ حال تھا کہ اُمید، خام خیالی کے آنے سے خوش تھی۔ ادھر بے حیائی اپنے یاروں کو خوشامد کے سپرد کرتی جاتی تھی۔ دشمن مخفی، جو شیطان کی طرح لپٹے ہوئے تھے، ملکہ کو ان کا خیال بھی نہ تھا۔

حضرتِ انسان کا قاعدہ ہے جب اپنے اوج پر آتے ہیں تو اصلیّت کو بھول جاتے ہیں۔ اچھوں کو گھٹاتے ہیں، بُروں کو بڑھاتے ہیں، ویسے ہی اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں:

مقامِ افسوس یہ ہے کہ ملک کی شان شاہی نہ رہی، دکھاوے کی رسموں پر آ گئی۔ زبانی خرچ بہت، باقی ندارد، مبالغے، استعارے، بلند پروازیاں، لفاظیاں حد سے زیادہ، مضمون و مدعا غائب۔ کتابیں جلدیں کی جلدیں، مطلب پڑھو تو ایک حرف نہیں؛ یا تعریف اور خوشامد یا بےلطف اور بےمعنی عبارتیں۔ انجام یہ ہوا کہ فقط اوپر اوپر کے تزک واحتشام تھے، اندر کچھ نہ تھا۔ یا تو ہر عرضی فوراً سنی جاتی تھی اور ہر بات پر خاطر خواہ توجہ ہوتی تھی، یا یا ہر ایک ایوان بنا کر اس کا نام منتظر خانہ رکھا گیا کہ اُمیدوار وہاں جا کر حاضر ہوا کریں، جن لوگوں کو بےحیائی خوشامد کے سپرد کرتی تھی، وہ بےروک اس گھر میں چلے جاتے تھے، کوئی مزاحم نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رنگ برنگ کا آدمی دربار میں آ کر بھر گیا۔ ملک ملک کے لوگ چلے آتے تھے اور فقط حماقتوں کے بھروسے پر اس جوش وخروش سے اظہارِ کمال اور امتحان دینے کو بڑھتے تھے کہ ایک پر ایک پڑا کرتا تھا۔

جب دربار کا رنگ بگڑتا ہے تو غرض مندوں کے خیالات اس سے بگڑ جاتے ہیں، مگر تم یہ خیال کرو کہ اس عالم میں غریب غرض مندوں پر کیا گزرتی ہے:

جو لوگ اس دربارِ عام میں شریک ہوتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ہم ملکہ کی خدمت میں پہنچ گئے، کیوں کہ ان کے لیے بڑا قوی وسیلہ تھا، یعنی خوشامد۔ خوشامد کے ہاں حقیقت اور واقفیت دونوں کو دخل نہیں، مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہاں سے معاملہ قسمت پر جا پڑا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اندر کا دروازہ خام خیالی کے سپرد تھا، اور وہ اپنے دل کی رانی تھی۔ جب چاہتی کھول لیتی تھی، جب چاہتی تھی بند کر دیتی تھی۔ غرضیکہ بدنصیب عرضی دار اپنی ساری عمر عزیز اس بدحالی میں برباد کرتے تھے کہ اندر وسواس داروغہ تھا اور اُمیدواروں کا یار بنا ہوا تھا۔ وہ دم بدم آتا تھا اور ایسی ایسی باتیں کان میں پھونک جاتا تھا کہ جن کا پورا ہونا قیامت تک ممکن نہ ہو اور اُمید کہتی تھی کہ ہاں ہاں اب حسنِ قبول کا خلعت دلواتی ہوں۔

ساتھ ہی اُس کے رشک ڈیوڑھی کا داروغہ تھا۔ اس کے گھر میں رات دن آگ پڑی دہکتی تھی۔ یہ سب اس کی سپردگی میں تھے، اور باوجودیکہ اس حال تباہ میں گرفتار تھے، مگر بدقسمتی یہ کہ اب بھی اتفاق نہ کرتے تھے۔ ایک ایک کو دیکھتے تھے اور جلے مرتے تھے اور آپس میں لڑتے تھے۔ عمارت مذکور میں اندھیرا چھایا تھا، دیواروں پر اُلّو بول رہے تھے، گرد بدنامی کی چیگاڈریں اڑتی

پھرتی تھیں، ان کی آنکھوں میں علم کی شعاعیں سوئیاں ہو کر چبھتی تھیں، اور پروں تلے سے ایسی خرابی و خواری کی بوندیں جھاڑتی تھیں کہ جس پر گرتی تھیں، داغ پڑ جاتا تھا۔

حق داروں کا حق کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے، مگر نہ اس قدر کہ طوفانِ نوح کا مقابلہ کر سکے:

ہرچند جس شخص کے داغ لگتا تھا، نیک نامی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھی، مگر خدا جانے بڑھاپا تھا یا بیماری کا ضعف تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ بے چاری ہرچند کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح اپنا رنگ پھیر کر اس دھبے کو چھپا دے، لیکن خرابی یہ تھی کہ اس کا رنگ بہت کچا تھا، ذرا پانی لگنے سے یا دھوپ میں رہنے سے اُڑ جاتا تھا کہ اس سے دھبے اور بھی روشن ہو جاتے تھے اور بدنامی کے داغ کبھی نہ مٹتے تھے۔ البتہ صداقت کے تخت کے نیچے ایک چشمہ جاری تھا، اس کے پانی سے خوب دھوئے جاتے تھے، مگر وہاں سے اس پانی کا آنا مشکل تھا۔ ہاں اگر لاتا تھا تو وقت ہی لاتا تھا۔

طوفانِ بے تہذیبی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے:

چوں کہ علوم کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ اپنے معتقدوں کو اس طرح تباہی کی حالت میں دیکھیں، اس لیے اکثروں کو لے لیتے تھے۔ چناں چہ وہ بھی تاک میں لگے رہتے تھے، اور جب موقع پاتے، کسی نہ کسی ڈھب سے ملکہ کی خلوت میں جا پہنچاتے تھے۔ ملکہ دیکھ کر فقط ابرو کا اشارہ کر دیتی تھی، یعنی منتظر خانے میں حاضر ہوں۔ وہاں کوئی ان کی سنتا نہ تھا، کیوں کہ ان بے چاروں کو نہ فقط رشک بل کہ وسواس بھی ستاتا تھا۔ بے حیائی ایک چیخ مار کر کہتی تھی کہ کیوں خواہ مخواہ گھس آئے، اور بدنامی کو اشارہ کرتی تھیں کہ جاؤ داغ لگا دو، اخباروں میں چھاپ دو، اشتہار دے دو، سارے جہان میں رسوا کر دو۔ یہ بچارے گھبرا کر گرتے پڑتے بھاگتے تھے۔ کسی کی کتاب چھوٹ پڑتی تھی، کسی کا عمامہ رہ جاتا تھا، مگر اکثر داغ بھی کھاتے تھے جو جو داغ لگ جاتے تھے، وہ نہایت مشکل سے دھوئے جاتے تھے، اور جن کے وہ داغ لگا ہوا تھا، لوگ دور ہی سے تاڑ جاتے تھے کہ ضرور کبھی نہ کبھی منتظر خانے کی ہوا کھا آئے ہیں۔

غرض مند بچارے ہر طرح ادائے خدمت کو حاضر ہیں، کاش کہ وہاں قبول ہوں۔ باقی امیدوار اُس مبارک گھڑی کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب خام خیالی اندر آنے کو اشارہ کرے، اور کب ہم حضور میں باریاب ہوں۔ یہ غرض مند بچارے احتیاج کے مارے اُسے خوش بھی کرتے تھے، مگر نہ فصاحت اصلی یا اشعار واقعی، یا خیال عالی سے، بلکہ برخلاف اس کے جھوٹی داستانیں، عاشقانہ افسانے، زٹلیات، ڈھکوسلے کہ ان میں ملکہ کی بھی تعریف ہوتی تھی اور اس کے شوہر، یعنی غرور کی بھی خوشامد ہوتی تھی۔ غضب یہ تھا کہ وہاں یہ بھی ایک آدھ ہی دفعہ سنی جاتی تھی۔ کچھ تو خوش طبعی چٹکیوں میں اُڑا دیتی تھی، کچھ بد دماغی کی چین جبیں میں چلے جاتے تھے۔ بعد اشخاص خام خیالی کی بدولت دربار تک پہنچ بھی گئے اور ملکہ نے قسمت سے انعام بھی ایسے ایسے دلوائے، جن کی آنکھیں خود بھی اُمید نہیں تھی، مگر تخت کے پا انداز میں کچھ سونے کی زنجیریں پڑی تھیں، جھٹ گلے میں ڈالیں اور وہیں باندھ دیا کہ ہردم زیرِ نظر رہو، مگر اشاروں پر کام کرو اور اسی طرح زندگی بسر کرو۔ لطف یہ تھا کہ لوگ ان زنجیروں کو پہن کر فخر کرتے تھے، اور کیسے ہی نازیبا اور بےعزتی کے کام لے، بلکہ گالیاں بھی دے، تو پیشانی پر بل نہ لاتے تھے۔ اس پر خام خیالی جب چاہتی تھی، کپڑے لتے تھی اور زیور ولباس اُتار، پھر منتظر خانے میں دھکیل دیتی تھی۔

یہ لوگ وہاں آکر پھر طوفانِ بےتمیزی کی بھیڑ میں مل جاتے تھے۔ وہاں بعض اشخاص جنھیں تجربے کی نصیحت نے کچھ اثر کیا تھا، وہ تو کسی اور راستے سے ہو کر نکل گئے اور کوئی اور خوش حالی کی راہ ڈھونڈ لی۔ باقی وہیں پڑے رہے، عمر گزار گئے اور خوشامد کے ذریعے سے خام خیالی کو خوش کرتے رہے۔ اتنے میں ایک اور بھیڑ کا ریلا آگیا۔ چناں چہ جب جگہ نے تنگی کی تو گرد مکانِ مذکور کے بہت سے کمرے تھے، ان میں سے ہر ایک کو حیثیت کے بموجب بیماری، کاہلی، سستی، شرمندگی، مایوسی کے کمروں میں ڈال دیا کہ وہاں وعدے اور وعدہ شکنی، خوشی اور ناخوشی، اُمید اور نا اُمیدی میں زندگی کے دن پورے کرتے رہیں اور آخر ملکِ عدم کو چلے جائیں۔

دیکھو! صبح کے راستہ بھولے ہوئے شام کو گھر آتے ہیں:

علوم وفنون نے بہت سے دھکے کھا کر معلوم کیا کہ اب اس جہان میں رہنا عزت نہیں، بلکہ بےعزتی ہے۔ ملکہ کے محل سے نکلے، تمام دنیا میں پھرے، تکلیف ومصیبت کے سوا کچھ نہ پایا۔

اتفاقاً ایک سبزہ زار میں گزر ہوا۔ ایک بہتے چشمے کے کنارے پر کچھ چھوٹے چھوٹے مکان اور کئی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ آزادی کی آرام گاہ یہی ہے۔ وہ تحمل کی بیٹی تھی اور قناعت کی گود میں پلی تھی۔ چناں چہ سب سے الگ اس گوشۂ عافیت میں پڑی رہتی اور کنجِ عافیت اس کا نام رکھا تھا۔ یہ مقام علوم وفنون کو بھی گزران کے قابل معلوم ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا تو دانائی، دوراندیشی، کفایت شعاری بھی موجود ہیں۔ علوم نے چندروز تک ان کی صحبت کو غنیمت سمجھا اور آزادی کے دامن کے نیچے اپنی عزت اور آسایش کو چھپا کر زندگی بسر کرنے لگے۔ اے اہلِ علم! اب وہی زمانہ ہے، عزت چاہو تو اس طرح گزارا کرو۔

کیوں آزادو! مجھے تو ان لوگوں پر رشک آتا ہے۔ جو شہرت کی ہوس یا انعاموں کی طمع پر خاک ڈال کر گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں اور سب بلاؤں سے محفوظ ہیں۔ نہ انعام سے خوش، نہ محرومی سے ناخوش، نہ تعریف کی تمنا، نہ عیب چینی کی پروا۔ اے خدا! دلِ آزاد دے اور حالتِ بے نیاز۔

علمیّت اور ذکاوت کے مقابلے

تمہید:

جو لوگ علم و کمال کی مسندیں بچھا کر بیٹھے ہیں، ان کی مختلف قسمیں ہیں؛ اوّل وہ اشخاص ہیں کہ جس طرح علم کتابی اور درس و تدریس میں طاق ہیں، اسی طرح حسنِ تقریر اور شوخیِ طبع میں براق ہیں۔ دوسرے وہ کہ ایک دفعہ کتابوں پر عبور کر گزرے ہیں، مگر پھر خالی ہڈیاں سمجھ کر ان کے درپے نہ ہوئے۔ ہاں ایجاد و اختراع پر مرتے ہیں، کبھی تقریر کرتے ہیں، کبھی تحریر کرتے ہیں، مگر اپنے اپنے موقع پر یہ عالم ہوتا ہے کہ قلم سے موتی برستے ہیں اور منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ تیسرے ایسے بھی ہیں کہ پیٹ کی الماری میں جہان کی کتابیں بھرے بیٹھے ہیں، لیکن تقریر کے میدان اور ایجاد کے موقع پر دیکھو تو فقط مٹی کا ڈھیر ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اخیر کے دونوں باکمال ایک دوسرے پر حرف رکھتے ہیں، بل کہ حریف کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان دونوں کی ہمیشہ چوٹیں چلتی رہتی ہیں، اور مناظرے اور مباحثے جو آئے دن جاری رہتے ہیں، ان میں مختلف منزلیں پیش آتی ہیں، جن کے اُتار چڑھاؤ سے اپنی غلطیوں کے سبب سے بار بار رفتار کے ڈھنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی طبیعتیں بھی مختلف ہیں، اسی واسطے دونوں کے طرف داروں سے دو جتھے ہو جاتے ہیں اور ان کے مباحثوں اور مقابلوں میں عجیب لطف دیکھنے میں آتے ہیں، جن کے نشیب و فراز کو نظرِ غور سے دیکھنا اقلیمِ علم کے سیاحوں کے لیے ایک عجیب تماشا ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے تمھیں کسی گلزار ملک کی سیاحی کا شوق پیدا ہو، اور ادھر کے کسی مسافر کا ایک سفرنامہ مل

جائے، یا اس سرزمین کا ایک نقشہ ہاتھ آجائے کہ گھر بیٹھے وہ لطف حاصل ہو جائے۔ داستان مفصلہ ذیل ان معرکوں کا ایک مرقع کھینچ کر دکھاتی ہے۔

صورتِ معرکہ:

کہتے ہیں کہ اقلیمِ خیال میں ایک وسیع ولایت تھی جس کا نام ملک فصاحت اور وہاں کے بادشاہ کا لقب ملک الکلام تھا۔ بادشاہ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں؛ ایک کا نام فرحت بانو اور دوسری کا نام دانش خاتون تھا۔ دانش خاتون کا ایک بیٹا تھا؛ یہ سیدھا سادا شخص حسنِ متانت میں باپ کا خلف الرشید اور تمکنت اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا، اسے علم کہتے تھے۔ فرحت بانو کی بیٹی ذکاوت تھی کہ باپ کے سبب سے خوش بیانی میں اسم با مسمّی اور ماں کے اثر سے زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختے کو شرمندہ کرتی تھی۔ چوں کہ فرحت بانو اور دانش خاتون دونوں سوکنیں تھیں، دونوں بچوں نے بگاڑ کا دودھ پیا تھا اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی، یعنی ابتدا سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں کہ ایک ایک کو خاطر میں نہ لاتا تھا، بلکہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بے زار تھا۔ باپ نے دیدۂ دوراندیش سے ان کی نااتفاقی کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لیے تھے۔ اس لیے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنائیت کی گرمیٔ محبت سے ملائم ہوں۔ آخر صورت یہ نکالی کہ اپنی نظرِ محبت کو دونوں میں برابر تقسیم کر دیا، مگر باپ کی شفقتِ منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا، کیوں کہ ماؤں کی طرف کی عداوت دور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی، اور بچپنے کے خیالات کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ بہت دُور تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ نئے نئے موقعے جو پیش آتے تھے، ان میں عداوت مذکور اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی، مگر ان میں شک نہیں کہ دونوں کے دونوں خوبی و کمال کی جان اور تعلیم و تہذیب کے پتلے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو عالم بالا کے پاک نہادوں کی نظران پر پڑنے لگی اور وہاں کی مہمانیوں میں آنے جانے لگے۔ چند روز کے بعد ذکاوت نے باپ کے اشارے سے اپنے نشاط محل میں بڑے بڑے اہلِ کمال کو جمع کر کے رقاصۂ فلک، یعنی زہرہ کی ضیافتیں کرنی شروع کیں مگر ان جلسوں میں علم کا سنگ بھرا، اور اس میں اس خوبی سے اس کی ہجو کی کہ محفل کو لوٹا لوٹا دیا۔ علم نے بہت برا مانا۔ چناں چہ اس کے توڑ پر قاضیٔ افلاک یعنی مشتری کی ضیافت کی اور اپنے زورِ علم سے شہزادی ذکاوت کی بے اصل سخن سازی اور بے علم طرازیوں کی

قلعی کھولنی شروع کی اور مشتری نے عطارد کے اتفاق رائے سے عمامۂ فضیلت اس کے سر پر بندھوایا۔ اسے تدبیر اور تقدیر کا انقلاب کہتے ہیں کہ ماں باپ نے جن لوگوں کو مویدِ کہہ کر فہمائش اور اصلاح کے لیے کہا تھا وہی چکانے لگے، اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ عداوت کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ اسی عالم میں دونوں بڑے ہوئے اور اب انھیں عالم قدس کے دربار میں جانے کا شوق پیدا ہوا، مگر وہ بھی اس لیے نہ تھا کہ خود کچھ عزت و حرمت حاصل کریں، بل کہ ہر ایک کی غرض یہ تھی کہ اپنے حریف کی عزت خاک میں ملائے، اور جو کچھ اپنے ڈھنگ میں اس نے زور پکڑا ہے، اسے آگے نہ بڑھنے دے۔ آخر کار دونوں کے جمال و کمال کی بدولت وہ دن آ پہنچا کہ رسم و رواج کے بموجب دربارِ آسمانی میں پہنچے۔ اول علم نے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور چند فقرے ثنائے الٰہی اور دعائے بادشاہی میں اس حسنِ تاثیر سے ادا فرمائے کہ سب کی آنکھیں آسمان کو لگ گئیں، اور سینہ ہائے گرم کے جوش سے محفل میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ بعد اس کے ذکاوت آگے بڑھی، زمینِ خدمت کو بوسہ دیا، مگر جب سر اٹھایا تو چند شعر پڑھ کر ایک تبسم زیرِلب کیا کہ گویا ایک چمن بھر زعفران لوگوں پر برسا دی۔ انعام یہ ہوا کہ دونوں عالمِ بالا کے پاک نہادوں میں داخل ہو گئے اور خواجہ خضر نے اپنے مبارک ہاتھ سے آبِ حیات کا جام بھر کر دیا کہ جب تک آسمان پر چاند اور سورج کا چاندی سونا ہے، تمھارا سکہ روئے زمین پر چلتا رہے۔ دربارِ آسمانی میں قدیم سے ملنساری اور اخلاق کا انتظام تھا، افسوس یہ ہے کہ اس وقت اس میں خلل آ گیا، کیوں کہ دربار میں داخل ہو کر دونوں نوجوانوں کے دماغ بگڑے، اور دل نمود اور افتخار کے جوش سے بھڑک اُٹھے۔ پھر اس پر ساتھ والوں کی واہ وا! غضب تھی کہ اُدھر اسے بڑھاتے تھے اِدھر اسے چڑھاتے تھے، مگر ان حملوں کی بوچھاڑیں دونوں کے جی چھڑائے دیتی تھیں، جن کا تار نہ ٹوٹتا تھا اور فتح کا یہ حال تھا کہ ادل بدل کرتی تھی، کبھی ادھر کا پلہ جھکا دیتی تھی کبھی اُدھر کا۔ ایک بالکل مغلوب نہ ہو جاتا تھا کہ دو ٹوک فیصلہ ہو جائے۔

جس وقت کہ بحث شروع ہوتی تھی تو ذکاوت اس زرق برق اور طمطراق سے آتی تھی کہ سب کو اس کی جیت نظر آتی تھی۔ بلبل کی طرح چہکتی اور پھولوں کی طرح مہکتی۔ پہلے ہی حملے میں تمام محفل مارے خوشی کے اس طرح چہک اٹھتی تھی کہ گویا کبھی نہ بجھے گی اور علم ر کبھی پھیکی صورت

بناۓ، اپنے زور کو ذرا دبائے رکھتا تھا، یہاں تک کہ تعریفوں کا جوش خروش بگولے کی طرح گزر جاتا، مگر اس کے بعد جو ٹھہرو گے تو خاطر جمعی سے سنو گے۔ پھر علم بھی دفعیے شروع کرتا۔ یہ عالمانہ دفعیے روکھے تو ہوتے تھے، مگر وہ یا تو حریف کے اعتراضوں کو آپس میں لڑا کر اس کی باتوں سے اسی کو جھوٹا کر دیتے تھے، یا یہ ذہن نشین کر دیتے تھے کہ ذکاوت کے دلائل اصلاً قابل وقار و اعتبار نہیں، یعنی اس نے سارے مقدمے کے مطلب کو تولیا ہی نہیں، ایک ٹکڑا توڑ کر اس پر باتوں کا طومار باندھ دیا ہے۔ اس تقریر کو سن کر سب آپس میں تصدیق و تسلیم کی نگاہوں سے دیکھتے، مگر پھر جب ذکاوت کی رسیلی آواز نکلتی تو سب کے کان ادھر ہی لگ جاتے۔ شور و غل، چپ چاپ اور ساری محفل ایسی خوشی ہوتی کہ سناٹے کا عالم ہو جاتا۔ اس میں بھی جہاں جہاں موقع پاتی، ظریفانہ لطیفوں اور ظریفانہ چٹکلوں سے علم کو ایسا چٹکیوں میں اُڑا جاتی کہ سننے والوں کے منہ میں تحسین و آفرین کا ایک حرف نہ چھوڑتی۔ پھر ادھر سے علم اپنے ہدایت نامہ کا طومار لے کر کھڑا ہوتا۔ اوّل تو ذکاوت کو اس کے کلام کا سفلہ پن دکھاتا کہ یہ متانت سے خالی ہے، جو رنگ اس نے جمائے تھے، انھیں حقیقی اور تحقیقی دلیلوں، بل کہ آیتوں اور روایتوں سے اس طرح مٹاتا کہ اہل نظر کو سوائے سر ہلانے اور بجا و برحق کہنے کے کچھ بن نہ آتی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اہل محفل نے اپنی غلط فہمی کو چھوڑنا شروع کیا اور جب محفل کا خاتمہ کر کے اٹھے تو علم کے دلائل صادقہ کے لیے عظمت دلوں میں لیے اٹھے۔ مگر جتنی اس کی عظمت لیے اٹھے، اتنی ہی اُس کی شوخی و شگفتہ بیانی کے لیے مہر و محبت لیے اٹھے۔

جب دونوں کے کمال اپنی اپنی اعزاز و قدر دانی کے لیے اہل نظر سے سفارش کرتے تھے تو حسن طلب کے انداز بالکل الگ الگ تھے۔ ذکاوت تیز اور بے باک ہو کر ایسی چمک دمک سے آتی تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ علم بھی آگے بڑھتا تھا، مگر اپنے وقار و متانت میں کمال بندوبست اور نہایت روک تھام سے قدم اٹھاتا تھا۔ ذکاوت کند ذہنی اور دیر فہمی کے داغ سے بہت بچتی تھی اور علم چوک جانے اور دھوکہ کھانے کے سوا کسی تہمت سے نہیں ڈرتا تھا۔ ذکاوت کی طراری کا یہ عالم تھا کہ سمجھنے سے پہلے ہی جواب دے اٹھتی تھی کہ ایسا نہ ہو میری تیز فہمی پر حرف آئے۔ علم کی یہ قباحت تھی کہ سیدھی سی بات میں بھی اس خیال سے اٹک جاتا تھا کہ حریف نے

اپنی تقریر میں جو جوتوڑ جوڑ مارے ہیں، ان میں سے ایک دقیقہ بھی بے کھولے نہ رہ جائے۔ بر خلاف اس کے ذکاوت علم کی ہر بحث کو جھٹ پٹ بل کہ اس گھبراہٹ سے خاک میں ملا دیتی تھی کہ وہ دیکھتا رہ جاتا تھا، مگر پھر علم اس کی بات میں بال بال کے فرق اس تفصیل سے دکھاتا تھا کہ سننے والے اکتا جاتے تھے، بل کہ جن باتوں کا آج تک کسی نے انکار نہ کیا تھا، ان کے ثبوتوں میں خواہ مخواہ بات کو طول دے کر وقت کو ضائع کرتا تھا۔ ذکاوت اپنی نمود کی ہوس میں ایسی باتیں بھی پیش کر دیتی تھی کہ جنھیں نہ سوچا تھا، نہ سمجھا تھا، اور اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر دل چسپ اور دل پسند خیالوں کو خوش نمائی سے دکھا کر کام یاب بھی اس قدر ہو جاتی تھی، جس کی اسے خود بھی اُمید نہ تھی۔

برخلاف اس کے علم اکثر قدما کے قدموں پر چلتا تھا۔ وہ نئے خیالوں سے بچتا تھا اور ڈرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں اُن نتیجوں میں پھنس جائے، جنھیں اس کی نظر پیش بین نہیں دیکھ سکتی۔ اکثر ڈھب ایسے آپڑتے تھے کہ اگر ذرا ہمت کام یاب کو اور آگے بڑھاتا تو دشمن کو مار ہی لیتا، مگر احتیاط جو اس کا جانی رفیق تھا وہ روک لیتا تھا۔

حق یہ ہے کہ غلط فہمی سے دونوں خالی نہ تھے اور اسی نے دونوں کو تیر ہائے اعتراض کے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ ایجاد و اختراع تو ذکاوت کے مصاحب تھے، اور قدامت اور تقلید علم سے محبت رکھتے تھے۔ چناں چہ اسی واسطے ذکاوت کو تو وہی بات پسند آتی تھی جو کہ آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ علم کا قاعدہ تھا کہ بزرگان سلف کے قدم بقدم چلتا تھا، اور ان کی ایک ایک بات پر جان قربان کرتا تھا۔ بل کہ اس کے نزدیک جس قدر بات پرانی تھی، اسی قدر سر اور آنکھوں پر رکھنے کے قابل تھی۔ برخلاف اس کے ذکاوت پرانے پن سے بہت گھبراتی تھی اور ہر رنگ میں نیا شعبدہ دکھاتی تھی۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ دلائل سے قائل نہ کر سکتی تھی تو لطائف و ظرائف ہی سہی۔ غرض واہ واہ والے بغیر نہ چھوڑتی تھی اور اسے قائل کرنے کی کچھ پروا نہ تھی، مگر علم اپنی رائے کو ہمیشہ ایسے سنجیدہ اصول اور نپے تلے قواعد سے سنبھالے رہتا تھا کہ اگر مقدمہ اس کے خلاف بھی فیصل ہو جائے، تو اس کے دلائل برجستہ کو یاد کر کے مدتوں تک تعریفیں ہوتی رہیں۔

مناظرے کے شوقینو! دیکھو، اب دونوں حریف اپنی اپنی چال بھولتے ہیں:

چند روز کے بعد ان کی طبیعتوں میں ایک تبدیلی واقع ہوئی کہ دونوں نے اپنی اپنی خاصیت اصلی کو چھوڑ دیا، یعنی ہر ایک یہ سمجھنے لگا کہ جو حربہ حریف نے کیا ہے، یہی حربہ میں کروں تو دوٹوک فتح ہو جائے؛ یعنی اس نے اس کے رنگ لینے شروع کر دیے اور اس نے اس کے ڈھنگ پر چلنا شروع کیا۔ چناں چہ دونوں طرف یہی چلتا ہتھیار ہو گیا، یعنی کبھی کبھی ذکاوت اور دلائلِ منطقی پر بھی طبع آزمائی کرتی تھی۔ علم ان دلیلوں کو لچر سمجھ کر فقط مسکرا دیتا تھا، مگر اس طرح کہ ان سب کی صورت بگڑ جاتی تھی۔ ساتھ ہی اس کے طرف دار چلاتے کہ واہ دلیل کا نام بھی نہ تھا، یہ تو باتوں ہی باتوں کا مصالح تھا۔ ان تجربوں میں دونوں نقصان پر نقصان پاتے تھے اور خود اپنی حقیقت کو دشمن کے ہاتھوں میں ڈال کر سبک ہوتے تھے، اور ذلتیں اٹھاتے تھے۔ غرض جس طرح ذکاوت کی طبیعت میں متانت و وقار اور بات میں بوجھ بھار نہ تھا، اسی طرح علم کے کلام میں ظرافت کا نمک اور رنگینی کا نقش و نگار نہ تھا۔ دو قدم چلتا اور گر پڑتا۔

یہ مباحثے ایسی مدت دراز تک جاری رہے کہ لازم و ملزوم ہو گئے اور عالم بالا میں بھی فرقے فرقے ہو کر دونوں طرف جتھے بندھ گئے۔ چناں چہ ذکاوت کو زہرہ نے اپنے دامن حمایت میں لے لیا اور تبسّم، تمسخر، مزاح، دل لگی کو اس کے ساتھ کر کے کہا کہ حسن و جمال کی پریوں میں جا کر جلسے کیا کرو۔ ادھر علم پر مشتری کی نظر عنایت رہی، مگر وہ تو خود خشک مغز تھے، اپنے محل سے باہر ہی نہ نکلتے تھے، اور جب نکلتے تو عصمتِ حرمت، عزّت، محنت، اعتدال، تحمّل، تقویٰ، روکھے پھیکے، کبھی کبھی کے بڈھے اور پراتم بڑھیا جلو میں لے کر نکلتے تھے، اور کسی درگاہ یا خانقاہ تک جا کر چلے آتے تھے۔

خوش بیانو! دیکھنا، طنز و تعریض کی نہ ٹھہرے، نہیں تو خواہ مخواہ لڑائی ہو پڑے گی:

نئی بات یہ ہوئی کہ ذکاوت کے سنگار خانے میں زیور و لباس پہنانے کے لیے دو کارداناں کی ضرورت ہوئی، اور اس میں طنز و تعریض آ کر نوکر ہو گئے۔ انھوں نے اپنی رفاقت میں ایک شخص کو رکھا تھا کہ جسے بغض دیوازاد کہتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کمان تھی اور پشت پر ایک ترکش آویزاں تھا، جس میں طعن و تعریض نے تیر بھرے تھے، اور عداوت کے زہر میں بجھائے تھے۔

ان تیروں کا اثر یہ تھا کہ جہاں لگتے وہاں جم کر ایسے بیٹھتے کہ نہ کسی جراح کا جتن چلتا، نہ کسی حکیم کا ہنر پیش جاتا۔ چناں چہ جب علم کسی امر مفید یا غور کے کام میں مصروف ہوتا یا اپنے معتقدوں کو فیضِ علم پہنچاتا، یہ اس وقت ذکاوت کی طرف سے تیر مارا کرتا۔ اس کا بندوبست اور کچھ نہ ہو سکا، فقط اتنا ہوا کہ مشتری نے نقطہ چینی اور غلط گیری کو دو ڈھالیں دے کر ساتھ کر دیا کہ اگر جواب ترکی بہ ترکی نہ ہو سکے تو اس سے روکا کرو۔ چناں چہ یہ دونوں اکثر تیروں کی نوکیں توڑ دیتے تھے، کبھی بھالا نکال کر پھینک دیتے تھے، کبھی اسی پر الٹ دیتے تھے۔

جب سلطانِ آسمانی نے دیکھا کہ ان کے آئے دن کے رگڑوں جھگڑوں سے عالمِ بالا کے امن میں خلل آنے لگا، تو بہت خفا ہوا اور ارادہ کیا کہ ان دونوں جھگڑالوؤں کو عالم خاکی میں ڈال دے۔ چناں چہ آخر کار دونوں دنیا میں آپڑے اور اپنے قدیمی جھگڑے یہاں بھی جاری کر دیے۔ یہاں دونوں کے ساتھ بڑے بڑے گرم جوش معتقد جمع ہو گئے۔ ذکاوت نے اپنی خوش نمائی سے نوجوانوں اور رنگین مزاجوں کو لبھالیا، اور علم نے اپنی متانت اور وقار سے پرانے پرانے بڈھوں کو پھسلایا۔ ان لوگوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں نئے نئے شگوفے کھلنے لگے، اور بڑے بڑے اثر اس کے ظہور میں آئے۔ چناں چہ ذکاوت کے جلوس کے لیے گلزار اور پُر بہار سیر گاہیں سجائی گئیں، جواس کے قدردان ہوں وہاں استقبال کو حاضر ہو۔ اسی طرح علم کے لیے مدرسے، مسجدیں، درگاہیں اور خانقاہیں قرار پائیں۔ دونوں جتھے اس پر جان دیتے تھے کہ شان وشکوہ اور نام وری اور دریادلی میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں، اس طرح کہ اپنے حریف کو گرد کر دیں اور اس عقیدے کے پھیلانے میں عرق ریزی کر رہے تھے کہ جو مخلوق دنیا میں پیدا ہو، اسے واجب ہے کہ دونوں میں سے ایک فریق میں ضرور داخل ہو۔ ساتھ اس کے یہ بھی تھا کہ جو شخص طرفین میں سے کسی کی بارگاہ میں ایک دفعہ بھی جا نکلے، پھر اسے دوسرے کی نظرِ عنایت کی اُمید نہ رکھنی چاہیے۔ اس خاکدان ظلماتی میں ایک خاکی جماعت تھی کہ وہ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ مانتی تھی۔ یہ لوگ روپی صورت، سونی مورت، دولت کے بندے تھے، اور اسی کی عبادت کرتے تھے۔ وہاں کیا علم، کیا ذکاوت کسی کی بھی دعا قبول نہ ہوتی تھی، اور سبب اس کا یہ تھا کہ ان کی آنکھوں پر روپے کی چربی چھائی ہوئی تھی، اور کانوں میں غفلت کی روئی تھی۔ ذکاوت نے ان پر

بہت بہت گل افشانیاں کیں، مگران کے لبوں پر کبھی تبسم کا رنگ بھی نہ آیا، اور علم نے بھی اپنی فصاحت و بلاغت سے بہت دماغ سوزی کی تھی، مگران کی طبع خوابیدہ نے پھریری بھی نہیں لی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کی آنکھیں روشن بھی ہو جاتی تھیں، مگر دولت کا ایک مرید خاص ان پر تعینات تھا۔ وہ اسی وقت آ کر ان کی آنکھوں میں ایک سورمہ دے جاتا تھا کہ ہر چیز انھیں چھوٹی اور حقیر ہی نظر آتی تھی۔ غرض ان کی کم نظری اور بے اعتنائی علم اور ذکاوت دونوں کو بری معلوم ہوئی۔ چناں چہ یہ دونوں متفق ہو گئے اور اپنے اپنے معتقدوں کو چڑھا کر بھیجا۔ انھوں نے اسی وقت دولت پرستوں کے عبادت خانوں کا رخ کیا، اور جاتے ہی کسی کے پہلو میں اشاروں کنایوں کی چٹکیاں لیں، اور کسی کی بغل میں ظرافت کی گدگدیاں شروع کر دیں۔ اس وقت سارے دولت پرست چونک پڑے اور جب کچھ بن نہ آیا، تو گھبرا کر روپے کو مدد کے لیے بلایا۔ روپے کے پاس بڑے نقش اور منتر تھے۔ وہ آیا، اپنے سارے ہتھ کنڈے چلتر کام میں لایا، مگر کوئی پیچ اس کا چل نہ سکا۔ پھر بھی اتنا ہوا کہ ذکاوت اور علم نے جو اپنے معتقد بھیجے تھے، ان میں پھوٹ ڈال دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے آقاؤں کے راز کھولنے شروع کر دیے؛ یعنی جو کچھ ذکاوت اور علم تحریر کرتے، یہ جھٹ دولت پرستوں کو خبر پہنچاتے۔ بل کہ جب کچھ تجویز دولت پرستوں کی ذات کے لیے عمل میں آتی تو یہ رشوت خوار کارگزار دل میں برا مانتے اور اگر کچھ حکم لے کر جاتے بھی تو دولت پرستوں کے سامنے خوشامد کے پیرائے میں ظاہر کرتے۔ وہ باوجود اس کے دل میں انھیں بھی حقیر ہی سمجھتے تھے۔ جب یہ خوشامدی رفتہ رفتہ دولت اور دولت پرستوں کے درجہ عنایت تک جا پہنچے تو خوشامد کی بدولت بڑے بڑے انعام اور جاگیریں حاصل کیں۔ چند روز کے بعد ایسے بد دماغ ہوئے کہ جو اہل عزت خود ان کے آقاؤں کے مصاحب تھے، ان سے پہلو مار کر چلنے لگے اور ان کے مقابل میں اپنے تئیں بہ نظر فضیلت دیکھنے لگے۔

القصہ جب ذکاوت اور علم دونوں نے دیکھا کہ اہل دنیا کا یہ حال ہے، اور جو نوکر اپنے تھے سب نمک حرام ہو گئے، تو دونوں نے مل کر دو عرضیاں تیار کیں، جن میں دولت اور دولت پرستوں کی زیادتیاں اور اپنے نمک حراموں کی بدذاتیاں سب لکھیں، اور سلطانِ آسمانی کی خدمت میں بھیج کر التجا کی کہ ہمیں ہماری قدیمی آرام گاہ میں جگہ مل جائے۔ یہ عرضی سن کر سلطانِ آسمانی داہنے

ہاتھ کو بڑے زور شور سے گرے۔ اس کے یہ معنی کہ ان سب کا روسیاہ کر دو اور دونوں ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس حسنِ طلب کو نہایت غنیمت سمجھے اور خوشی خوشی شکریے کرتے ہوئے چلنے کو تیار ہوئے۔ ذکاوت نے جھٹ بازو پھیلائے اور غبار سے دامن جھاڑتی ہوئی آسمان کو اُڑی، لیکن اس فضائے لاانتہا میں کہ جہاں راہ نہ رہ نما، نظر دُور تک کام نہ کر سکتی تھی، اس لیے چند ہی قدم پر رستہ بھول گئی۔ علم رستے خوب جانتے تھے، چناں چہ انھوں نے بھی پر خوب ہلائے، مگر ان کے غرض کہ ہاتھ پاؤں مار کر دونوں زمین پر آپڑے۔ اس وقت ایک دوسرے کی مصیبت کو خیال کر کے سمجھے کہ اب اتفاق کے سوا گزارا نہیں۔ ناچار دونوں نے ہاتھ ملائے اور پھر اُڑے۔ علم کو تو ذکاوت کی قوتِ پرواز کا سہارا ملا اور ذکاوت کو علمِ دور بین نے رستہ بتایا۔ پلک مارتے سلطانِ آسمانی کے دربار میں جا داخل ہوئے۔ چوں کہ بگاڑ کے مزے دونوں نے خوب چکھ لیے تھے، اس لیے اب کی دفعہ دونوں میں بہت محبت اور اخلاص ہوا، مگر ذکاوت نے علم کو صلاح دی کہ بھائی تم ذرا حسن اور ظرافت اور اس کی سہیلیوں سے نشست و برخاست رکھا کرو۔ اسی طرح انھوں نے ذکاوت کو سمجھایا کہ تم ذرا اصلاح و اعتدال کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرو۔ ان صحبتوں نے دونوں کی طبیعتوں میں بڑا اثر کیا۔ علم کی خشک دماغی کو حسن اور ظرافت کی طراوت پہنچی، ذکاوت کی شوخی و طراری نے صلاح سے اصلاح پائی۔ دونوں آہستہ آہستہ عالمِ بالا کے پری زادوں میں ایسے ہر دل عزیز ہو گئے کہ جس جلسے میں نہ ہوں، اس میں رونق ہی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چند روز کے بعد سلطانِ آسمانی کے ایما سے دونوں نے شادیاں کر لیں اور ان کی نسلوں سے علوم و فنون کی اولاد کے سلسلے جاری ہو گئے۔

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملکِ فنا کے رہنے والو! دیکھو اس دربار میں تمھارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں، جنھوں نے اپنے ملک کے نام پر میدانِ جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں، جنھیں اُسی ہاتفِ غیبی کا خطاب زیبا ہے، جس کے الہام سے وہ مطالبِ غیبی ادا کرتے رہے اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزمِ تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعثِ فخر رہے۔ بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بتاتے رہے، جس سے ملکِ فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے؛ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لیے فنا نہیں، دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا، جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرتِ دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا ثوابِ آخرت کے لیے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لیے ہوئے، لیکن میں اس دربار میں انھی لوگوں کو لاؤں گا، جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور نام وری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال دیتا ہوں، مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں، اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے، کیوں کہ جن بچاروں نے ساری جان فشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا، اُن کے حصے میں کسی طرح کا نقصان ڈالنا سخت ستم ہے۔ اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چناں چہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں کہ انھوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی، اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلے میں گزری۔ نامورانِ موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چوں کہ

بیان اُس کا لطف سے خالی نہیں، اس لیے عرض کرتا ہوں۔

خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدان! وسیع الفضا میں جانکلا ہوں، جس کی وسعت اور دل فزائی میدانِ خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدانِ مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انھیں محاسبِ فکر شمار کرسکتا ہے، نہ قلمِ تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے، اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کام یابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے، جس کی چوٹی گوش سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو، ایسے سرپھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرتِ انسان کے ناخنِ تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ میرے دوستو! اس رستے کی دشواریوں کو سرپھوڑ اور سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں، مگر بڑی ناانصافی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لے تو ان بلاؤں کو جھیلے۔ جن پر وہ مصیبتیں گزریں، وہی جانیں۔ یکا یک قلّۂ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دل کش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی، بل کہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی، جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اتنے میں انبوہِ کثیر میں تھوڑے ہی اشخاص تھے، جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا اور وہ تعجب فوراً ہی جاتا رہا، یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوب صورت عورتیں ہیں، اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں، مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں نہ پری زاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت، کوئی عیاشی ہے، کوئی خود پسندی، کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انھی میں پھنس کر اہلِ ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اُن پر درختوں کے جھنڈ سایہ کیے تھے، رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے، گونا گوں میوے جھوم رہے تھے، طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں، اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھینٹے اڑ

رہی تھیں، مگر ایسے ایسے الجھاوے بلندی کوہ کے اُدھر ہی اُدھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں، وہ اگرچہ اقوام مختلفہ اور عہد ہائے متفرقہ، عمر ہائے متفاوتہ رکھتے ہیں، مگر وہی ہیں جو حوصلے کے چھوٹے، ہمت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔
دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ، صاحب ہمت، عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندیٔ کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے، اسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے کہ بلندیٔ کوہ پر چڑھ جائیں، اور جس طرح ہو سکے، پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی سے قوت روحانی حاصل کریں۔ چناں چہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی، ایک ہاتھ میں نشان تھا، کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزا تھے، کسی کی بغل میں ایک کمپاس تھی، کوئی پنسلیں لیے تھا، کوئی جہازی قطب نما اور دوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا، بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علم ریاضی اور جرثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس وقت کام نہ آ رہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرم جوشی تمھاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اُس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقے فرقے میں تقسیم ہوگیا۔ کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چناں چہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہولیے۔ وہ تھوڑی ہی دور چڑھے تھے کہ ان کا رستہ ختم ہوگیا اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دست کاری کی راہ لی تھی کہ روپے کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے تھا، جنھوں نے دلاوروں اور جاں بازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پالیے، مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دیے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھ کر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہوگئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے، مگر جب دیکھا تو

بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتۂ رحمت نے ہدایت کی کہ یہ وہی رستے ہیں جہاں عقلِ صادق اور عزمِ کامل کام دیتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے، مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا کہ جتنا گھٹنوں میں بڑھے تھے، اُتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہوگئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جوروزگار سے ترقیاں تو حاصل کرتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی ایسی حرکت ناشائستہ کرتے ہیں کہ دفعتہً گر پڑتے ہیں اور آیندہ کے لیے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اتنے عرصے میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں، او پر آکر وہ شاہراہوں سے ملتے ہیں۔ چناں چہ وہاں آکر تمام صاحبِ ہمت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان دونوں شاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھ کر ایک بھوت ڈراؤنی صورت، ہیبت ناک مورت، کھڑا تھا کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک ہاتھ میں ایک درختِ خاردار کا ٹہنا تھا۔ بھوت کا نام دیوِ ہلاکت تھا اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بہانے تھے، جو اولوالعزموں کو راہِ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چناں چہ جو سامنے آتا تھا، ٹہنے کی مارمنہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ ان کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہلِ ہمت کے بھاگ بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے، اور ڈرڈر کر چلاتے تھے کہ" ہے ہے موت! ہے ہے موت!" دوسرے رستے پر جو بھوت تھا اس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا، لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ معیوب کلے، جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے، اس لیے ان کا منہ ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طرف دیکھانہ جاتا تھا۔ اُس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا کہ برابر چھینٹیں اُڑائے جاتا تھا، اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو اکثر اشخاص ہم میں سے بے دل ہو کر رہ گئے، اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا اور قدم آگے نہ اٹھتا تھا۔ اتنے میں اس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ کان میں آئی کہ بجھے ہوئے ارادے پھر چمک اٹھے۔ جس قدر کہ دل زندہ ہوئے، اسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اڑتے گئے۔ چناں چہ بہت سے جان باز، جو شمشیر یں علم کیے

ہوئے تھے، اس کڑک دمک سے قدم مارتے آگے بڑھے، گویا حریف سے میدانِ جنگ مانگتے ہیں، یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا، بس یہ اس دہانے سے نکل گئے اور وہ موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے، وہ اُس رستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا، مگر اس آواز کے ذوق شوق نے انھیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے، کیچڑ میں نہاتے، مرپچ کر یہ بھی اس کی حد سے نکل گئے۔ چناں چہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں، وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں، آگے دیکھا تو ان کی دسترس سے باہر ہیں، اور رستہ بھی صاف وہموار بلکہ ایسا خوش نما ہے کہ مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک ہی سانٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اس میدانِ روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی، جس سے روح اور زندگانی کو قوتِ دوامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام میدان، جو نظر کے گردو پیش دکھائی دیتا تھا، اس کا رنگ کبھی نورِ سحر تھا اور کبھی شامِ شفق، جس سے قوسِ قزح کے رنگ میں کبھی شہرتِ عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی و تشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے، اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلا تھا جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوانِ عالی شان دکھائی دیا کہ اس کے چار طرف پھاٹک تھے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے جس کے میٹھے میٹھے سُروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی، اور سُروں سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفرین وشاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ گویا آنے والوں کو آفرین وشاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ "خیر مقدم، خیر مقدم، خوش آمدید، صفا آوردید"۔ اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چناں چہ مورخوں کا گروہ ایک دروازے پر استادہ ہوا تا کہ صاحب مراتب اشخاص کو حسبِ مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکا یک وہ شہنائی، جس سے کبھی شوق انگیز، جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے، اب اس سے ظفریابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔

جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا، معلوم ہوا کہ کوئی راجوں کا راجا مہاراجا ہے۔ چاند کی روشنی چہرے کے گرد ہالہ کیے ہے، سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اس کی حق داری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جاں نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایے میں لیے آتے ہیں۔ فرقے فرقے کے علما اور مورخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے، اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا، مگر ایک شخص کہن سالہ، رنگت کا کالا، ایک پوتھی بغل میں لیے ہندوؤں کے غول سے نکلا اور بآواز بلند چلایا کہ ''آنکھوں والو! کچھ خبر ہے؟ دیکھو! دیکھو! ترتیب کے سلسلے کو برہم نہ کرو اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ۔'' یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پوتھی نذر گزاری۔ اس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا، تو معلوم ہوا اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا۔ اس وقت ایک بمان یعنی تخت ہوادار آیا، وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اُڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ رام چندر جی ہیں اور یہ والمیک ہے، جس نے ''رامائن'' نذر دی۔

سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ہی ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تختِ طلسمات کو بتیس پریاں اڑائے لیے آتی ہیں۔ اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقے فرقے کے علما اور مورخ لینے کو نکلے، مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجہ تو مہاراجہ بکر ماجیت تھے اور تخت ''سنگھاسن بتیسی''۔ پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے، نہ آپ کا منہ ہٹے گا نہ سکہ مٹے گا۔ برہموں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انھیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجا کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل وقال ہوئی، کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے، اور اراکینِ دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گزارا نہیں۔ اتنے میں وہی بتیس پریاں پھر آئیں۔ چناں چاں کی سفارش سے اسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجا نے مسند پر قدم رکھا، ایک پنڈت آیا، دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیر باد کہی، اور بقائے دوام کا

تاج سر پر رکھ دیا، جس میں ہیرے اور پنے کے نو (۹) دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ راجہ بھوج تھے اور بتیس پریاں کا جھرمٹ وہی کتاب "سنگھاسن بتیسی" تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی، اور جس نے تاج سر پر رکھا اور کالی داس شاعر تھا، جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھا، اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا، دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش، جھاڑ فانوس سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ ایک جوان پیل پیکر، ہاتھ میں گرز گاؤ سر، نشۂ شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شاہان کیانی اور پہلوانان ایرانی موجود ہیں کہ درفشِ کاویانی کے سایۂ بے زوال میں لیے آتے ہیں۔ جب قوم اور حبِ وطن اس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے۔ اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا، اور سر پر کلۂ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مؤرخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ سب نے بہ چشمِ تعظیم دیکھا۔ ان ہی میں سے ایک پیر مرد، دیرینہ سال، جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار نمایاں تھے، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا، اور ایک کرسی پر بٹھایا، جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہلِ مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور شور سے پڑھے۔ نہیں، بل کہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی، جو قیامت تک باقی رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گُلِ فردوس کا طرّہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی کہ "الٰہی! یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے"! تمام اہلِ محفل نے آمین کہی۔

معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی، شیرِ سیستانی رستم پہلوان ہے، اور کہن سال مایوس فردوسی ہے جو "شاہ نامہ" لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا، جس کا حُسن شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا، سر پر تاج شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ ساتھ اس کے حکمتِ یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا، مگر سب اسے دیکھ کر ایسے محو ہو گئے کہ کسی

نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مؤرخ اور محقق اس کے لینے کو بڑھے، مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیار ہوا تھا۔ چناں چہ ایک شخص، جس کی وضع اور لباس سب سے علاحدہ تھا، ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مؤرخ تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھایا۔ فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی طرف آجاؤ تا کہ تمھاری نظر سب پر پڑے اور تمھیں کوئی نہ دیکھ سکے۔ یہ سکندر یونانی ہے، جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

اس کے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہِ کیانی اور اس پر درفشِ کاویانی جھومتا تھا، مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا، اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی؛ وہ دارا بادشاہِ ایران تھا۔

دفعتہً سکندر نے آواز دی: "انھیں لاؤ!" جو شخص داخل ہوا، وہ ایک پیر مرد برگ صورت تھا کہ مقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا، سکندر خود اٹھا، اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا، اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں "خمسہ" کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا: "اب یہ کبھی نہ کملائیں گے۔"

بعد اس کے جو شخص آیا، اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحتِ روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا جو لوگ اب تک آ چکے تھے، ان سب سے زیادہ عالی رتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا اور بائیں پر جالینوس۔ اس کا نام سقراط تھا۔ چناں چہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے اُستاد، یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا، مگر اس مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق

ہے، اور یہ کہہ کر اوّل سکندر کو آئینہ دکھایا اور پھر نظامی (گنجوی) کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کے ذیل میں آیا۔ سب جبّہ و عمامہ اور طبل و دمامہ رکھتے تھے، مگر باہر رو کے گئے، کیوں کہ ہر جند اُن کے جتنے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے، مگر اکثر ان میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چناں چہ دو شخص اندر آنے کے لیے منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علما و فضلا کا ہولیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے اُن کے ساتھ تھے۔ بل کہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لیے اشیر باد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں ہارون رشید اور دوسرا مامون رشید تھا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک اور تاج دار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی استخوان اور ولایتی لباس تھا اور جامہ خون سے قلمکار تھا۔ ہندستان کے بہت سے گراں بہا زیور اس کے پاس تھے، مگر چوں کہ ناواقف تھا، اس لیے کچھ زیور ہاتھ میں لیے تھا، کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آب داری سے پانی ٹپکاتے تھے، مگر جہاں قدم رکھتا تھا، بجائے غبار کے آہوں کے دھوئیں اُٹھتے تھے؛ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اس کے استقبال کو بڑھے، مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چناں چہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گزاری سے ہاتھ اس کا پکڑا۔ اگر چہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا؛ وہ ایاز تھا۔ اسی عرصے میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا، مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے، مگر تمام علما و فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا، ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی، اُس پر آ کر بیٹھ گیا؛ وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے، مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق ان کے نقش و نگار سے گل زار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصوّر ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصوّر بے شک اچھے ہو، مگر بے اصل

اور غیر حقیقی اشیا کے مصور ہو۔ تمھاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں، البتہ انتخاب ہوسکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چناں چہ انوری، خاقانی، ظہیر فاریانی وغیرہ، چند اشخاص منتخب ہوکر اندر آئے، باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا، اُس میں سے آبِ حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں، مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں بھی لہراتی نظر آتی تھیں، اس لیے اس پر پھر تکرار ہوئی۔ اس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفعِ اعدا کے لیے تلوار دی ہے، مگر ملکِ مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بدنہاد ہمارے خونِ عزت کے بہانے سے کب چوکیں۔ چناں چہ یہ عذر اُن کا قبول ہوا؛ یہ انوری تھا جو باوجود گل افشانیِ فصاحت کے بعض موقعے پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ خاقانی پر اس معاملے میں اس کے اُستاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چوں کہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی، اس لیے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہوسکا۔ اس عرصے میں چنگیز خاں آیا۔ اس کے لیے گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا، بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اُسے چشمِ حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا، البتہ مورخوں کے گروہ نے بڑے ہوم دھام کی، جب کسی کی زبان سے نسب نامے کا لفظ نکلا تو اُس نے فوراً شمشیرِ جوہر دار سند کے طور پر پیش کی، جس پر خونیں حرفوں سے رقم تھا: ''سلطنتؐ میں میراث نہیں چلتی''، علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بوآئے وہ قصاب ہے، بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصورانِ تصانیف کی تحریر نے رنگِ بقا نہ ڈالا ہو، اُسے اس دربار میں نہ آنے دیں۔ اس بات پر اس نے بھی تامّل کیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون نے حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا، تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اُٹھاتا۔ اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے، انھوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں طورۂ چنگیز خاں، یعنی ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو، مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا؛ اس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اس

کے لیے چند علمانے بھی مؤرخوں کا ساتھ دے دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا، مگر ایک مردِ بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا، جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی، لیکن کمر میں ایک طرف اُصطرلاب، دوسری طرف اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں، بغل میں فلسفے اور حکمت کے چند اجزا تھے؛ اُن کا نام محقق طوسی تھا۔ چناں چہ انھیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اُسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو بوعلی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھالیا کہ آپ نے میری کلاہِ شہرت میں بقائے دوام کے آب دار موتی ٹانکے، شکر یہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مؤرخوں نے اس کے لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو دروازے پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا، کیوں کہ وہ مؤرخ تھا، رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہلِ تصنیف! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض خدا نے جو تمھیں قلم تحریر دیا ہے، اسے اظہارِ واقفیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے یا اغراضِ نفسانی اور بدزبانی میں؟ تمام مؤرخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے۔ اس پر امیر تیمور نے ابنِ عرب شاہ کے بلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ چناں چہ اس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ اک بزرگ، آزاد وضع قطعِ تعلق کا لباس بر میں، خاکساری کا عمامہ سر پر، آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا مؤرخ و شاعر سے جھکائے اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازے پر آکر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا: "معذور رکھو، میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے" اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے، اگر تمام اہلِ دربار کا شوق طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے، ایک طلسمات کا شیشۂ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا کہ اس میں کسی کو دودھ کسی کو شربت، کسی کو شرابِ شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین انھیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا، مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی ان کا دیوان تھا، جو فلکِ مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔

لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے کہ دور سے دیکھا، بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے، بیچ میں ان کے ایک پیر مرد، نورانی صورت، جن کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرّہ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں گل دستہ، دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگر چہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے، مگر انھیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیوں کہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اوران کی ''گلستان'' اور ''بوستان'' کو نہ جانتا تھا۔ انھوں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی سعدِ زنگی کو پوچھا۔ اُس بے چارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی، لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر اُن سے واقف تھے اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے، وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے۔ باوجود اس کے یہ ہنسے اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے: ''دنیا دیکھنے کے لیے ہے، برتنے کے لیے نہیں''۔

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چناں چہ ایک اولوالعزم شخص آیا، جس کے چہرے سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو مؤرخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے۔ بلکہ چغتائی خاندان کے مؤرخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اُس نے باوجود اس کے ایک کرسی، جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا، گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمایوں اُسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا، مگر پھر تاجِ شاہی پر انداز کجکلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بے حد بے استقلال ہے۔ اُس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن اور اُن کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلیں گے اور فخر کریں گے۔

تھوڑی دیر بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہ کثیر ایرانی، تورانی اور ہندستانیوں کے فرقہ ہاے مختلف کا بیچ میں لیے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا، تمام اہلِ دربار کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھیں اور رضا مندیِ عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے، ہندو اُسے ہندو جانتے تھے، آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا، نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے، مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی

شکایت کر کے بدایونی پر خون کا دعویٰ کیا کہ اس نے میری حیاتِ جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا، اور وہ فتح یاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا، نیت کا پھل ہے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندوراجا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحبِ جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اُس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چوں کہ دولت اس کے ساتھ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہ جہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مؤرخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹو گراف ہاتھ میں لیے ہوئے تھے، جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی اور سینکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضا مندیِ عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا، مگر ایک جوان آنکھوں سے اندھا، چند بچوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہر یار، شاہ جہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اُس کے آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا، بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا، بل کہ خلائقِ خدا کے امن اور ملک کے انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہر حال اُسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطینِ چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجے پر ممتاز ہوا۔

ایک تاج دار آیا کہ جبہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا، دوسرے ہاتھ میں جو فردِ حساب تھی اس میں غرق تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتاتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ انھیں خانقاہ میں لے جانا چاہیے، اس دربار میں ان کا کچھ کام نہیں، لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا، وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے اراکینِ دربار! ہمارے ظلِ سبحانی نے اس کم بخت سلطنت کے لیے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا، اس پر بھی

تمھارے اعتراض، اس دربار میں اسے جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اُس نے اس مسخرہ پن سے ادا کیا کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انھیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا کہ وہ عالم گیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خاں عالی تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈا جوان، دکھنی وضع، جنگ کے ہتھیار لگائے راجگی کے سکے تمغے سے سجا ہوا آیا۔ اس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے بل کہ عالم گیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ صاحب! ہمت کو جگہ دو یا نہ دو، وہ آپ جگہ پیدا کر لیتا ہے؛ یہ سیوا جی تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندستانی تھی۔ مصنفوں اور مؤرخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی اُن میں گویا اور کوئی بھانڈ، کوئی مسخر نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آئے تھے کیوں کہ ایک ولایتی دلاوران کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخمل رومی کی کلاہ تھی جس پر ہندستان کا تاج شاہی نصب تھا، اور اسپ بخارائی زیرِ ران تھا، وہ ہندستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو نکالو، ان کا یہاں کچھ کام نہیں، چناں چہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا، جس نے سرحدِ روم سے بخارا تک فتح کر کے تاجِ ہندستان سر پر رکھا تھا۔ اُسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا، کوئی گل دستہ ہاتھ میں لیے تھا۔ انھیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندستانی شاعر تھے۔ چناں چہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا، اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے، لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے ہوئے تھے، مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے، کوئی نہ کوئی اُٹھا ہی لیتا تھا؛ وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم، ذی وقار متقی و پرہیزگار، دم میں ڈاڑھ چٹ، بھنگ کا سونٹا کندھے پر۔

جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا، مگر جب وہ میٹھی زبان سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گل کاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلم کاری اس کی عینک کی محتاج تھی، مگر آتش کی آتش زبانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے، جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیر مرد، دیرینہ سال، محمد شاہی دربار کا لباس جامہ پہنے، کھڑکی دار پگڑی باندھے، جریب ٹیکتے آتے تھے، مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان سے دست و گریباں ہو جاتے، لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا، یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میر امن دہلوی "چار درویش" کے مصنف تھے اور بانکے صاحب مرزا سرور "فسانۂ عجائب" والے تھے۔ ذوق کے آنے پر سند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انھوں نے اندر آ کر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اُٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج اُن کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے، پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگے میں بیٹھنا قبول نہ کرے، مگر پھر وہیں کوئی بولا کہ اسے جن لوگوں میں بٹھاؤ گے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے، اسے دربارِ شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمے پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے اُلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں

آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا، اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی، مُردوں سے زندوں میں تو آیا۔

خاتمہ:

اگرچہ خیالات کے جلسے جمے ہوئے ہیں اور اشخاصِ تصوّری زبان ہائے بے اجسام سے طلسم کاری کر رہے ہیں، لیکن سو کے قریب صفحے سیاہ ہو چکے۔ اب جلسہ ختم اور کچھ عرصے کے لیے کلام کا دروازہ بند۔ اے اہلِ انجمن! آپ کا آنا، مبارک آنا، قدم بر چشم، مگر جلسۂ آیندہ کی ابھی سے گزارش قبول ہو کہ حصہ دوم کا سامان بہم پہنچے۔

جنّتُ الحُمقا

تمہید:

مضمون مفصلہ ذیل ایک مرقعِ خاص کی تصویر کا خاکہ ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ ہم اور ابنائے جنس ہمارے کچھ اپنی غلط فہمی سے اور کچھ کوتاہ اندیشی سے اعمال قبیحہ یا حرکاتِ ناپسندیدہ میں مبتلا ہیں، اور باوجود یہ کہ اس کے حال و مال کی قباحتوں سے آگاہ ہیں، بل کہ اور ہم صورتوں کو ان کے خمیازے بھرتے دیکھتے ہیں، پھر بھی کنارہ کش نہیں ہوتے۔ تعجب یہ ہے کہ جب اپنی جگہ بیٹھتے ہیں تو اس ارتکاب کو داخلِ حسن سمجھ کر اس میں افراط اور زیادتی کرنی سرمایۂ فخر سمجھتے ہیں۔ ایک شراب خوار آدمی یاروں میں بیٹھ کر فخریہ بیان کرتا ہے کہ میں کئی کئی بوتلیں اُڑا جاتا ہوں اور حواس میں بالکل فرق نہیں آتا۔ دوسرا اس سے بڑھ کر اُچھلتا ہے کہ میں پانی تک نہیں ملاتا، مگر آواز میں اصلا تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک عیاش تماش بین اپنی روسیاہیوں کو کہتا ہے اور نہیں شرماتا۔ دوسرا اس میں اپنی شدتیں اور افراطیں بیان کرتا ہے اور خوشی سے رنگ رخ چمکتا ہے۔ ایک دغاباز منشی یا دیوان غبن کر کے آقا کے گھر کو برباد اور اپنا گھر آباد کرتا ہے اور جو جو دغل فصل حساب کتاب میں کیے، انھیں مسائلِ افلاطون کی طرح فخریہ سمجھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جیسا کرتے ہیں ویسا بھرتے ہیں، مگر خدا جانے وہ کیا شے ہے جس نے ایسا پردۂ غفلت آنکھوں پر ڈال رکھا کہ نہ وہ برائیاں بری معلوم ہوتی ہیں، نہ ان سے باز آتے ہیں۔ یہی کوتاہ اندیشی کبھی ایک غلط فہمی کے لباس میں ظہور پاتی ہے، یعنی اکثر اشخاص خاص خاص امور میں اپنے کمال پر

مفتخر اور نازاں ہوتے ہیں۔ ہر چند امورِ مذکور بجائے خود قابلِ فخر و ناز کے ہیں، مگر بشرطِ کہ ان میں کمال نصیب ہو۔ فی الحقیقت اُسے غلط فہمی کہنا چاہیے جو کہ نتیجہ حماقت اور ایک قسم کی کوتاہ اندیشی کا ہے، چناں چہ یہ لوگ بھی ابتدا میں ناواقفیتِ عوام کے سبب سے رونق بازار پاتے ہیں، مگر چند روز چے طے کرکے گر پڑتے ہیں اور سخت ندامت اٹھاتے ہیں۔ افسوس کہ کوئی زمانہ اس قسم کے گناہوں سے خالی نہیں بل کہ روز بروز حال ابتر نظر آرہا ہے۔ اس لیے یہ مضمون ابنائے جنس کی عبرت کے لیے ایک استعارے اور کنایے کے رنگ میں لکھا جاتا ہے۔ ہر چند یہ رنگ صورتِ مضمون کے منہ پر ایک باریک نقاب ہے، لیکن اگر اہلِ نظر چند ساعت کے لیے نظرِ غور کو تکلیف دیں گے تو یہ استعارے صراحت اور وضاحت کے پہلو میں رکھے ہوئے پائیں گے:

دل تیرا آپ پردہ ہے دل دار کے لیے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے
آزاد

دنیا میں اکثر قباحتیں اور حماقتیں ایسی ہیں کہ ہم سب ان میں آلودہ ہیں مگر معلوم نہیں ہوتیں۔ درحقیقت وہ ہماری رسائی فہم سے بہت اونچے طاق پر رکھی ہیں، اور کچھ ایسے ڈھب سے سجائی گئی ہیں کہ ہر بدی عین خوبی نظر آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ آلودگی ہمیں کچھ بری بھی نہیں معلوم ہوتی، بل کہ بجائے اس کے رفع کرنے یا چھپانے کے خود دکھاتے ہیں اور آرزوئیں کرتے ہیں کہ اپنی قباحتوں میں ترقیاں کریں اور انھی میں ہماری قدر دانیاں ہوں۔ چناں چہ سینکڑوں واہیات، ہزاروں لغو خیالات، نئے مسخرا پن، ظرافتوں کے چمن ہیں کہ وہی ہماری تفریح طبع اور خوش دلی کا سرمایہ ہو رہے ہیں اور یہ رنگینیاں ہمیں ایسے ایسے رنگوں میں رنگین کرکے ابنائے جنس کے سامنے جلوہ دیتی ہیں کہ ہم بھی انھی میں خلعتِ افتخار لیتے ہیں۔ اس فخرِ بے ہودہ اور خیالِ بے بنیاد کی خوشی میں خدا جانے کیا لطف دیکھا ہے کہ سیانے دنیاداروں نے اس کی دل فریبوں کا اشارہ کرنے کے لیے ایک لطیف اصطلاح چھانٹی ہے، یعنی ''جنت الحمقا۔''

لفظ آخر میں شاید لوگوں کو کچھ غلطی کا خیال ہو اور جو کچھ میں نے کہا انھی کی نسبت کچھ اور وضع دکھائی دیتی ہو، لیکن مجھے اب اس کا امتحان کرنا بے جا ہے، کیوں کہ میں جو اس وقت آنکھیں مل رہا ہوں، تو یہی خواب دیکھ رہا تھا۔

ابھی سوتے سوتے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے، مگر عجیب پہاڑ ہے کہ سبزے سے لہلہاتا، پھولوں سے چہچہاتا، جا بجا پانی لہراتا ہے۔ چڑھائی اس کی ہمت بلند کا نمونہ ہے مگر باوجود اس کے اعتدال پر ہے کہ دم نہیں چڑھنے دیتی، بل کہ ساعت بہ ساعت سینے کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ میں ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ اتنے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو میدان فراغ پایا، اور دور سے نظر آیا کہ ایک جگہ آب رواں میں پاؤں لٹکائے کوئی شہزادی بیٹھی ہے کہ زیور اور لباس سے طاؤس مرصّع کا عالم ہے مگر آنکھ سے بھینگی ہے اور اس بھینگی آنکھ پر رنگین عینک بھی لگائے ہے کہ اسی سبب سے اسے کوئی شے حالتِ اصلی پر نظر نہیں آتی۔ چناں چہ معلوم ہوا کہ ملکۂ غلط فہمی یہی ہے اور کل اہل عالم کی غلط فہمی گویا اسی کی نگاہ پر منحصر ہے۔

برابر اس کے ایک اور عجوبۂ روزگار نظر آئی کہ اس کے بے انتہا سر ہیں اور دھڑ ایک۔ جس بات کی پسند اور ناپسند پر سر ہلاتی ہے، تمام جہان کے سر اسی طرح ہل جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پسندِ عام اسی کا نام ہے۔ ان میں سے ایک غلط نمائی کرتی شیفتہ و فریفتہ کر لیتی ہے۔ یہ دونوں رات دن جادوگری میں مصروف ہیں اور تسخیرِ خلائق کے عمل میں شہرۂ آفاق ہو گئی ہیں۔

لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ چاروں طرف سے انبوہ در انبوہ اُمڈے چلے آتے ہیں، اور اگر چہ آمد کے رستے بھی دو ہیں، مگر ہر رستہ انھی دونوں کی طرف جاتا ہے۔ آنے والوں میں بعض آدمی، جو خود آرائی کے رنگ سے رخ چمکائے ہوئے اور زیبائی کے روغن سے سر چکنائے ہوئے تھے، انھیں کچھ ہدایت یا اشارات کی حاجت نہ تھی۔ خود بخود غلط فہمی کی طرف چلے جاتے تھے، اور وہ عالم فریب ایک ایک شخص کو اس کی طبیعت کے موافق اس طرح لبھاتی تھی کہ لٹو ہو جاتا تھا۔ بعد ازاں کچھ ایسی کل مروڑتی تھی کہ خود پسندِ عام کے پھندے میں جا کر گلا رکھ دیتا تھا۔

غرض کہ اسی طرح پھرتے پھرتے ہم ایک میدان جانفزا میں جا نکلے۔ وہاں دیکھیں تو پسندِ عام چہل قدمی کر رہی ہے، اور بہت سے لوگ، جو ہم سے بھی پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے،

انھیں پھسلارہی ہے۔ آواز اس کی ایسی رسیلی تھی کہ دل مست ہوئے جاتے تھے۔ جب بات کرتی تھی تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، بولتی تھی تو سانس کے ساتھ خوشبو کی لپیٹیں آتی تھیں۔ لطف یہ تھا جس شخص سے بات کرتی تھی، جدا ازبان اور جدا طرز بیان تھا، اور جو سنتا تھا یہی خیال کررہا تھا کہ وہ جو ہر بے مثل جو خاص میری ذاتِ باکمال میں قابلِ قدر ہے، اسی کی بابت یہ گفتگو ہو رہی ہے۔ پس گویا اس جنتِ بے زوال کا فرمان ملا، جس کے انعام کا استحقاقِ کلی مجھ میں موجود ہے۔

غرض اسی حال میں ہم سب کچھ کچھ اس کے پیچھے چلے جاتے تھے۔ اور مسافت راہ میں یا تو اپنی خوبیوں کی خود آپس میں تعریفیں کرتے جاتے تھے، یا اپنی خیالی خوبیوں پر آپ ہی اتراتے تھے یا انھیں اپنی وضع کا نہ پاتے تھے ان کی ہجو کرتے جاتے تھے۔ کچھ اپنے اپنے مدارجِ کمال پر آپس میں لڑتے جھگڑتے چلے جاتے تھے۔

غرض اسی عالم میں چلے، چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا جو کہ اسم با مسمی اندھیریا باغ تھا۔ اس کے دروازے پر دیکھیں تو غلط فہمی بیٹھی ہے، مگر جس مکان میں وہ بیٹھی تھی، اُسے عمداً ایسی حکمت سے بنایا تھا کہ صورت اُس کی دھندلی سی نظر آتی تھی۔ اس نے کچھ سفید سا لباس پہن رکھا تھا کہ جس سے دیکھنے والوں کو ملکۂ صداقت کا دھوکا ہوتا تھا، اور چوں کہ شہزادی صداقت پری ایک مشعل بھی ساتھ رکھا کرتی ہے، جس سے اپنے عاشقوں کو حسنِ خدا آفریں کی خوبیوں کا جلوہ دکھاتی ہے، اُس نے اُس کے جواب میں داہنے ہاتھ پر شیشۂ جادو اور بائیں ہاتھ پر سحر سامری کی چھڑی رکھی تھی۔ ان ہی ٹونے ٹوٹکوں سے لوگوں کو لبھاتی تھی اور دھوکے دغا سے سب کو پرچاتی تھی۔ چناں چہ کبھی کبھی بڑی تمکنت سے ہاتھ بڑھا کر اس چھڑی کو اُٹھاتی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ نرگس جادو بہت ناز و انداز کے پھول اور نمود و نمایش کی کلیاں گود میں بھرے کھڑی تھی۔ انھیں اہلِ اشتیاق کے سامنے بکھیرتی جاتی تھی۔

دفعتاً عصا کا اشارہ آسمان کی طرف ہوا اور ساتھ ہی اس کے سب کی نگاہیں اوپر اُٹھ گئیں۔ ایک نیلا قطعہ آسمان کا ایسا صاف و مصفّٰ دکھائی دیا جیسے صبحِ بہار سے فلک فیروزی کا رنگ نکھرا ہوا ہو۔ اسی فضائے دل کشا میں ملکۂ خام خیالی کا محل نظر آیا کہ آسمان سے باتیں کرتا تھا، مگر معلوم نہ ہوتا تھا کہ کون سی بنیاد ہے، جس پر یہ قائم ہے۔ فقط پیچ در پیچ بادلوں کا ایک زنجیرہ تھا کہ جادو کے

زور سے ادھر کھڑا تھا۔ اس کی چڑھائی کا راستہ جو ہمارے زیرِ قدم تھا، قوسِ قزاح کی طرح خوش رنگ و خوش نما تھا۔ نسیم جاں بخش جو ادھر اُدھر سبزے پر لوٹتی تھی، ہر جھونکے میں عقل و حواس پر جادو کی پڑیاں مارتی تھی۔ تمام دیواریں طلسمات کے رنگ سے دم میں سنہری تھیں اور دم میں رُوپہلی۔ سب سے نیچے کے درجے کے ستون اگرچہ باغِ ارم والی تراش پر اُتارے تھے، مگر برف کے تراشے تھے۔ چھت کا گنبد نہایت عالی شان تھا، لیکن برج کی جگہ ایک ایسے شیشے کا بلبلہ دھرا تھا اور اس کے کلس پر طائرِ خیال کا ہُما پر پھیلائے تھرتھرا رہا تھا۔

مسافروں نے وہاں پہنچ کر نہ کوئی دربان پایا، نہ کسی کا انتظار کیا، جو آیا اپنے جوہرِ قابلیت کو پروانۂ اجازت سمجھے ہوئے بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ دربار کے کمرے میں پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ بہت سی نمود بے بود صورتیں ہیں کہ ہم ہی میں ملی جلی اہتمام کرتی پھرتی ہیں اور اس انبوہِ بے تمیزی میں اپنے سے خیالات کے بموجب ایک ایک کر کے درجے قائم کر کے صفیں ترتیب دیتی پھرتی ہیں۔ مدارج عزت بھی وہاں روشن ہوتے ہیں، مگر ساعت بہ ساعت دھوپ کی طرح ڈھلتے جاتے ہیں اور لوگ تھے کہ بتاسے کی طرح بیٹھے جاتے تھے۔ استحقاق پوچھو تو دادا پردادا کے وقت کا ایک پھٹا پرانا سا پٹہ تھا، اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک طرف لاف گزاف تھی جس نے اپنی ذات خوش صفات کا ایک قصیدہ بنا رکھا تھا۔ آپ ہی اس اعمال نامے کو پڑھتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ اُسے اپنے سواد و سرا ذکر نہ تھا۔ اکڑ تکڑ تھی کہ پنجوں کے بل چلتی تھی اور اینٹھتی پھرتی تھی۔ خود پرستی ایک طرف آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ آپ ہی اپنے تیئں دیکھتی اور پھولی نہ سماتی تھی۔ کمرے کے صدر میں تختِ شاہانہ اور آگے ایک شامیانہ اس شان و شوکت سے سجا ہوا تھا کہ جس قدر سجاوٹ کے گمان میں گنجائش اور حوصلۂ آرایش میں وسعت تھی، سب اس میں خرچ ہو گئی۔ تخت پر ہالہ و ماہ کا چتر، اس کے نیچے ملکۂ خام خیالی لمعۂ آتش بازی کے دو پر لگائے پری بنی بیٹھی تھی، جو اس کے خیال پرست تھے وہ اُسے پریِ حسن آفریں کہتے تھے اور زہرۂ ثانی اعتقاد کرتے تھے۔ ایک نوجوان تخت کے پہلو میں کھڑا تھا اور ہر ایک کو سامنے لا کر سجدے کروا تا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس کا رشید بیٹا ہے اور شہزادہ خود پرست اس کا نام ہے۔ اس کی خود پسندی اور خود بینی کا یہ عالم تھا کہ اپنی نظر اپنے پیچ میں غرق ہوئی جاتی تھی۔

ادھر اُدھر کی شے اسے اصلا نظر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی لوگوں کا یہ حال تھا کہ ملکہ سے زیادہ اس کی طرف جھکتے تھے۔ ایک گلاب پاش اُس کے ہاتھ میں تھا، بقدرِ حیثیت ہر شخص کے سر پہ چھڑک دیتا تھا کہ خود پسندی اور بلند نظری کے خمار سے دماغ اُن کے آسمان تک پہنچ جاتے تھے۔ تماشا یہ تھا کہ شہزادہ جو جو ہتھیار فتوحات کے لیے کام میں لاتا تھا، وہ انھی لوگوں سے لیے تھے، جن کو شکار کرتا تھا۔ چناں چہ جس بہادر کو اپنے تیر کا نشانہ کرتا تھا، اُسی کے سر کی کلغی نوچ کر اپنے تیر کی پرگیری لگاتا تھا۔ جس نیزے سے اہلِ علم پر وار کرتا تھا، وہ انھی کے لکھنے کا قلم تھا۔ جس تلوار سے دولت مندوں کو دو پارہ کرتا تھا، اس کے قبضے پر انھی کے خزانوں سے لے کر سونا چڑھاتا تھا۔ ناظمانِ ملک کے لیے دامِ تزویر بناتا تھا کہ پھندے اس کے انھی کی بندشِ تدبیر سے اڑائے ہوئے تھے۔ صاحب جمالوں کے رُخساروں سے گرمیِ حُسن لیتا تھا اور عاشقوں کے ساتھ اسی میں انھیں بھی گرماتا تھا۔ یہاں تک کہ حُسن کے پھول خود بخود کُمھلا کر رہ جاتے تھے۔ فصیحوں کی زبانوں سے بجلی کی تڑپ نکالتا تھا کہ اپنی آگ میں آپ ہی جل کر خاک ہو جاتے تھے۔

تخت کے نیچے تین چڑیلیں پریوں کا بھیس بھرے حاضر تھیں۔ اوّل تو خوشامد تھی کہ بڑی خوش ادائی سے رنگ آمیزی کا خود سنبھالے کھڑی تھی۔ دوسری ظاہر داری آئینہ سامنے رکھے اپنے فن کی مشق کر رہی تھی۔ بعد اس کے خوش رواجی تھی، جسے اب تک ہم بھیڑ چال کہتے تھے مگر اُسے دربار سے رعنائی اور خوش نمائی کا خطاب ملا تھا۔ اس کا یہ عالم تھا کہ ہر نگاہ میں گرگٹ کی طرح نیا رنگ بدلتی تھی اور ہزاروں شکاروں کو ایک جال میں گھسیٹتی تھی۔

غرض کہ شہزادہ خود پرست شمشیر کے زور اور تدبیر کی لاگ سے برابر فتوحات حاصل کیے جاتا تھا اور یہ تینوں دولت خواہ اس کے استحکام اور محافظت میں برابر مصروف تھے۔ ہر کام کا مہتمم اپنا حق صدقِ دل سے ادا کر رہا تھا۔ چناں چہ خوشامد جس سے ہر ضرورت دیکھتی تھی۔ نئے سے نیا رنگ چڑھا دیتی تھی کہ ہر دل کی آنکھ کو خوش آتا تھا۔ ظاہر داری ایسے ایسے ڈھنگ سے نمایش دیتی تھی کہ کیسی ہی بدنما شے ہو، خوشنما ہو جاتی تھی۔ خوش رواجی کا یہ عالم تھا کہ موٹے سے موٹے عیب ہوتے انھیں ڈھانک دیتی، بل کہ ان پر ایسی خوبیاں چپکاتی کہ جنھیں اس سے کچھ لگاؤ بھی نہ ہوتا۔

میں اُن حالات کو نگاہِ غور سے دیکھ رہا تھا، جو ایک آوازِ دردناک کان میں آئی؛ گویا کوئی کہتا

ہے: ''ہائے آدم زاد! ہائے تیری غفلت! خودآرائی سے ہدایت پاتا ہے، غلط فہمی کے دام میں آ جاتا ہے، خود پسندی کی اشتعالک سے چمک اُٹھتا ہے، خام خیالی کے قدموں پر چل کر تعلیم پاتا ہے، یہاں تک کہ مفلسی اور خواری کی زنجیروں میں گرفتار ہو جاتا ہے'۔ یہ کلمے ابھی ابھی زبان بہ زبان پھیلنے نہ پائے تھے جو جو دفعتہً ایسی ہلچل پڑی کہ تمام انبوہ تہہ و بالا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک طرف سے رستہ کھلتا ہوا معلوم ہوا۔ دیکھوں تو ایک بڈھا نورانی صورت، معقول وضع ہے، جس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت برستی تھی۔ اُسے گرفتار کیے لاتے ہیں اور جو کلام عبرت انگیز نصیحۃً اس نے زبان سے نکالا تھا، اس کی سزا دینے کو لیے جاتے ہیں، کیوں کہ وہ اُن کے آئین حکومت میں سراسر باعث خرابی تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، فقط بری الذمہ ہونے کو کہا تھا۔ اس کا نام ناصح دانش ہے۔

مگر لوگ ایسے بپھرے ہوئے تھے کہ اس بے چارے کی بات سنی بھی گوارا نہ تھی، بل کہ اُسے ایسی خواری اور زاری میں دیکھ کر خام خیالی بھی مسکراتی تھی، خود پسندی تیوری چڑھاتی تھی۔ خوشامد ذرا اسے راست باز سمجھتی تھی، اس نے اتنا لحاظ کیا کہ برقع اوڑھ کر برابر سے نکل گئی۔ ظاہرداری نے اپنا پنکھا اُٹھا کر اُس کی اوٹ میں منہ چڑا دیا۔ کسی نے اس بچارے کا نام حاسد رکھا، کسی نے عیب جُو کا خطاب دیا۔ رواج نے دھوم مچا دی کہ بداطوار، سلطنت کے برخلاف بغاوت پھیلانی چاہتا ہے۔ غرض اس پیر دیرینہ سال نے ہر طرف سے ذلت ہی ذلت اُٹھائی اور اس جرم میں کہ ایسے ایسے لائق و فائق معزز کے حق میں گستاخی کی، چاروں طرف سے دھکے کھائے، بلکہ تحقیق خبر لگی کہ اگرچہ اس طرح نکالا گیا ہے مگر حکم ہے کہ آیندہ اگر کہیں صورت دکھائی تو اس کے حق میں بہت برا ہوگا۔

بڈھے بے چارے نے جو کچھ کہا، اس میں بہت کچھ تو میں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، باقی باتوں کے لیے سوچ رہا تھا کہ دیکھیے کس رنگ سے پوری ہوں۔ اتنے میں باہر کی طرف سے ایک غل اُٹھا اور ظلم و ستم اور بے انصافیاں چڑیوں کے برن میں اس طرح اُڑنے لگیں گویا آندھی آئی۔ انھوں نے اس کثرت سے ہجوم کیا کہ دروازہ تیرہ و تار ہو گیا۔ بے وقوفی اور بے اعتباری نمودار ہوئی۔ تکلیف، شرم، رسوائی، حقارت، مفلسی سب آگے پیچھے حاضر ہوئیں۔ ان کے آتے ہی ادھر تو

خام خیالی، جو سونے کی چڑیا بنی بیٹھی تھی، ادھر شہزادہ خود پرست، ان کے ساتھ ساری پریاں دم کے دم میں ہوا ہو گئیں۔ ادھر تمام معتقد اور ہوا خواہ ان کے بھاگ بھاگ کر کونے گوشے اور سوراخوں میں گھس گئے، مگر ایک شخص میرے پاس کھڑا تھا، اُسے کہیں سے دور بین ہاتھ آ گئی، چناں چہ اس نے دیکھا اور دفعۃً بولا کہ وہ گرفتاری کا حکم ہوا۔ وہ سو آدمیوں کا غول جیل خانے کو چلا، وہ ہزار آدمی تہہ خانے میں قید ہونے کو چلے، وہ سب اندھیری کوٹھڑیوں میں بند ہو گئے۔ مُراد اس قید سے زندگی کے عذاب، دُنیا کے دھندے، مکر و فریب کے جھگڑے تھے۔ جن مکانوں میں وہ لوگ ڈالے گئے، ان کی خرابی دیکھنی چاہو تو دل ہائے پریشان کو دیکھ لو۔ وہ لوگ اگر چہ یہاں ہائے دائے بہت سے کرتے تھے، مگر نکلنے کے رستے کی طرف کبھی خیال نہ کرتے تھے۔ چناں چہ اس شخص نے ناک چڑھا کر کہا کہ یہ کم بخت اپنی حماقت اور شامتِ اعمال سے آپ یہاں پڑے ہیں، نہیں تو نہ یہ مکان ان کی شان کے قابل ہیں، نہ یہ اخراجات اُن کے سامان کے لیے کافی ہیں۔ خیر ہم نے ایسے تماشے بہت دیکھے ہیں، اب یہ پَل چل ہو چکے گی تو پھر وہی بہار کا سماں ہو گا۔

جب میں نے یہ سُنا تو اس کارخانے کی ناپائداری نے میرا دل بیزار کر دیا۔ میرے رفیق نے جو خبر دی تھی، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جب دیکھا کہ بغیر گرفتار ہوئے یہاں سے نہ سرکے گا، تو میں چپکے سے دروازے کی طرف کھسکا اور چند شخصوں میں جا ملا کہ جو صداقت اور واقعیت کو مانتے تو نہ تھے، مگر ان شامتِ اعمال کے گرفتاروں کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ جب ہم دروازے کی دہلیز پر پہنچے تو دل پر صدمہ عظیم گزرا، یعنی وہاں آ کر غلط نمائی کا پردہ آنکھوں سے اُٹھ گیا۔ تب معلوم ہوا کہ اس محل کی بنیاد بالکل نہیں، معلق ہوا میں کھڑا ہے۔ اوّل تو ہم نے سوائے اس کے چارہ نہ دیکھا کہ موت کا کنواں ہے، آنکھیں بند کر وا ور کود پڑو، مگر اس پہلی ہوسِ بے حاصل پر دل کو ہزار لعنت ملامت کی، جس نے اس عذاب میں گرفتار کیا۔

اب مقام تعجب یہ ہے کہ جس قدر یہ سب اپنے اپنے دل میں غور کرتے جاتے تھے، اتنا ہی وہ محل ہمیں نیچے اُتارتا جاتا تھا۔ یہاں تک جو حالت ہم اپنے مناسب حال دیکھتے تھے، اُسی انداز پر آ کر ٹھہر گیا۔ رفتہ رفتہ تھوڑی دیر میں جہاں ہم کھڑے تھے، وہ مقام زمین سے لگ گیا۔ ہم سب نے نکل کر اپنا اپنا رستہ لیا اور محل آنکھوں سے غائب ہو گیا۔ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ اس میں

رہے اُن پر کیا گزری اور انھیں ہمارے اُتر جانے کی خبر بھی ہوئی یا نہیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ نہیں ہوئی۔ خیر جو ہو سو ہو، اس سوچ میں دفعۃً میری آنکھ کھل گئی۔ خواب تو خواب و خیال ہو گیا، مگر نصیحت ہوئی کہ اب خام خیالی کے اشاروں پر کبھی نہ چلوں گا، اس راہِ خطرناک میں پھر قدم نہ دھروں گا۔

خوش طبعی

خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شے ہے۔ البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں ہے۔ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں تو افلاطون حکیم الٰہی کی طرح کنایے اور استعارے سے بیان کروں، اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اس سے وہ صفتیں منسوب کروں، جو کہ نسب نامۂ مندرجہ ذیل میں درج ہیں؛ یہ واضح ہو کہ سچ، خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے۔ اس گھرانے میں حسنِ ادب ایک نہایت معقول شخص تھا، اس کا بیٹا حسن بیان ہوا۔ اس نے ایک اپنے برابر کے خاندان میں شادی کی، اس کی دلہن کا نام خندہ جبیں تھا کہ آٹھ پہر ہنستی رہتی تھی۔ چناں چہ ان کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے۔

چوں کہ خوش طبع سارے خاندان کا لب لباب تھا اور بالکل مختلف طبیعت کے والدین سے پیدا ہوا تھا، اس لیے اس کی طبیعت بوقلموں اور گونا گوں تھی۔ کبھی تو نہایت سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا تھا اور کبھی رنگین بانکا بن جاتا تھا۔ کبھی ایسا بن کر نکلتا کہ گویا قاضی القضات یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں اور کبھی ایسے مسخرے بن جاتے کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھاتے، لیکن چوں کہ ماں کے دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے، اس لیے کسی حالت میں وہ اہلِ محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا۔ اسی کے ہمسائے میں ایک مکرباز، جعل ساز بھی رہتا تھا کہ اس نے بھی خوش طبع اپنا نام رکھ لیا تھا اور لوگ بھی اس بدذات کو اسی کا قائم مقام سمجھتے تھے۔ پس اس خیال سے کہ نیک مرد، ناواقف اس کے دھوکے میں نہ آئیں، میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اگر کبھی ایسے شخص سے ملیں، تو اس کی اصل نسل کو اچھی طرح سمجھ لیں اور غور سے دیکھیں کہ دور نزدیک کچھ رشتہ اس کا سچ کے قبیلے سے جا ملتا ہے یا نہیں۔ وہ حسنِ ادب کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے یا کسی اور سے؟ اگر یہ نہ ہو تو وہی جعل ساز بہروپیا سمجھیں۔

ایک پہچان اس کی یہ بھی ہے کہ جب کسی محفل میں بیٹھا ہوتا ہے تو اسی کے قہقہے کان میں

آتے ہیں اور گرداس کے متین اور معقول لوگ خاموش بیٹھے نظر آتے ہیں اور جب ظرافتِ اصلی محفل آرا ہوتی ہے تو آپ کمال سنجیدگی سے بیٹھی رہتی ہے۔ گرداس کے سب ہنستے ہیں۔ بل کہ اتنی بات اور بھی کہتا ہوں کہ اگر اس کے خاندان میں خوش طبعی یا خندہ جبینی یا خوش بیانی کسی کی بو نہ آئے تو اسے بھی وہی جعل ساز بہروپیا سمجھنا چاہیے۔

جس بہروپیے بھانڈ کا میں نے ذکر کیا، وہ اصل میں جھوٹ کی اولاد سے ہے، اور جھوٹ حقیقت میں ژٹل کا باپ تھا۔ ژٹل سے ایک بیٹا پیدا ہوا کہ اس کا نام سڑی مستان تھا۔ اسی طرح حماقت ایک پھوہڑ عورت تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی جسے مسخرن دیوانی کہتے تھے۔ اس سے سڑی مستان نے شادی کی۔ ان دونوں سے عجب طرفہ معجون بچہ پیدا ہوا جسے تم بہروپیا بھانڈ سمجھتے ہو۔ بعض اشخاص کو بعض اوقات اس کے کلام میں بھی خوش طبعی یا خوش بیانی کی بو آتی ہے، مگر وہ حقیقت میں ظرافت بد اصل ہے۔ اب میں اب دونوں کا نسب نامہ لکھتا ہوں۔

جھوٹ

ژٹل

سڑی مستان مسخرن دوانی

ظرافت بداصل یا نقل

یعنی بہروپیا بھانڈ

سچ

حُسنِ ادب

حُسنِ بیان

خوش طبع خاوند　　خندہ جبینی بی بی

ضرافتِ اصل یا خوش طبع

میں اس استعارے کو زیادہ تفصیل دیتا اور ظرافت بد اصل یعنی بہروپیے بھانڈ کی اولاد، جو ریگِ بیاباں سے زیادہ ہے، سب کا حال نام بنام بیان کرتا، خصوصاً ان لڑکے لڑکیوں کا کچھ حال لکھتا، جن سے ملک وجود میں اس نے اپنی ناپاک نسل پھیلائی ہے۔ مگر اُس سے جا بجا حسد کی آگ بھڑک اٹھتی، اس لیے جی نہیں چاہتا پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ظرافتِ اصلی اور ظرافت نقلی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آدمی اور بندر میں۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اسے بندر کی طرح جھوٹ موٹ کی دغا بازیاں اور ویسے ہی نقلیں کرنے کی عادت ہے۔ دوسرے اس قسم کے کام کر کے نہایت خوش ہوتا ہے؛ بل کہ دونوں باتیں اسے یکساں ہیں، خواہ خلعت پہنا دے خواہ رسوا کر دے۔ ابھی ایک شخص کو باعظمت واحترام بنا دے، ابھی چٹکیوں میں اُڑا دے۔ کسی کی نافہمی و بد عقلی دکھا دے، کسی کی دانش و دانائی سنا دے۔ ابھی دولت و نعمت کی مسند پر بٹھا دے، ابھی کنگال فقیر بنا دے۔ سبب اس کا یہ کہ جھوٹ کی تھیلی ہر وقت بھری ہے، کبھی خالی نہیں ہوتی۔ تیسرے ایسا کم بخت ہے کہ جو ہاتھ اسے رزق دیتا ہے اسی کو کاٹ کھاتا ہے اور دوست دشمن دونوں کی برابر خاک اڑاتا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انسانیت سے خارج ہے، اس لیے خوش طبعی ہونی چاہیے اور جہاں ہونی چاہیے۔ چوتھے، چوں کہ عقل سے محروم ہے، اس واسطے اخلاق یا صلاحیت کی نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرتا۔ پانچویں، چوں کہ ہنسی چہل کے سوا اور کسی قابل نہیں اور ہر شخص پر فوقیت کی

ہوس رکھتا ہے، اس کا تمسخر ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے، یعنی کسی صاحب معاملہ یا کسی صاحب تصنیف کی ذات سے منسوب ہوتا ہے، نہ کہ فقط اس کی برائی یا تصنیف سے۔

نکتہ چینی

نکتہ چین نا انصاف کی بدولت تصنیف کا کیا حال ہوتا ہے:

مصنف اپنی تصنیف میں یا تو نئے نئے مطالب اور تازہ مضامین سے دلوں کو شگفتہ کرتا ہے، یا مطالب معلوم کو بنا سنوار کر نئی آرایش وزیبایش سے سامنے لاتا ہے۔ کبھی نئی روشنی کا جلوہ دے کر دیدۂ نظر باز کو عجائب و غرائب تماشے دکھاتا ہے، کبھی دیکھی بھالی چیزوں کو نئے رنگ دے کر اور موقع مقام بدل کر انھی میں تازگی اور دلربائی کے انداز پیدا کرتا ہے۔ بل کہ ایسے رنگ برنگ کے گل پھولوں سے سجاتا ہے کہ ہر چند ایک دفعہ طبیعت ان کی گل گشت کر چکی ہو، مگر خواہ مخواہ پھر دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور جن چمنوں پر عقلِ سبک سیر جلدی گزر گئی ہو، یا سرسری نظر کر گئی ہو اس کا دوبارہ دل میں اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔

درحقیقت ان محنتوں میں سے جس محنت کو دیکھو، مشکل سے مشکل ہے، کیوں کہ تصنیف مذکور کے مفید اور کارآمد ہونے کے لیے اتنی ہی بات کافی نہیں ہے کہ لوگوں کو اُن کی غلط فہمی یا عیب وصواب سے آگاہ کر دے، بل کہ ایک انداز برتا چاہیے، جس سے ان کے دلوں میں اپنے رہ نما یعنی مصنف کا اُنس اور اس کے کلام کا اشتیاق پیدا ہو، اور اس کے سبب سے وہ فقط اپنی ناواقفیت کا اقرار ہی نہ کریں، بل کہ ایک اس سے بھی کڑوا گھونٹ ہے، اسے گوارا کریں، یعنی یہ بھی سمجھیں کہ یہ دل آگاہ خیر خواہ ہم سے زیادہ تر دانا ہے۔

جو شخص مراتب، مذکورہ بالا پر نظر کرے گا، وہ خود سمجھ لے گا کہ ہر ایک بات اُن میں پرلے سرے کی خطرناک اور نہایت جانکاہی کا کام ہے پھر ایسا بے درد کینہ ور کون ہو گا کہ قانون بے چارہ، جو خود عذاب خدا کا مارا ہے، اس کے بوجھ میں پتھر بھر دے اور اسے ایک دل لگی سمجھے۔

کیسی بے درد کوششیں ہوں گی جو ایسے آرزو مند کا دل توڑنا گوارا کریں، کہ نہ ان سے کسی

شے کا طالب ہے، نہ ان کے کام میں کچھ حارج ہے۔ فقط اتنی بات ہے کہ اپنی یا اپنے کلام کی شہرت چاہتا ہے۔ اسی کے لیے یہ مصیبتیں ہیں کہ وقت عزیز کو صرف کرتا ہے۔ آرام کو تکلیف سے بدلتا ہے، چراغوں کے دھوئیں کھاتا، دماغ کا عرق پیشانی سے ٹپکاتا ہے اور ان سب منزلوں کا پہلا قدم یہ ہے کہ اکثر تو کامیابی کی جگہ ناکامی اٹھاتا ہے اور کامیاب ہو تو فائدہ قلیل۔ یہ بے چارہ ان مصیبتوں پر بھی صبر کرتا ہے اور اپنے شوق کو پورا کرتا ہے۔

ہاں ایک نسل کے آدمی ایسے بھی ہیں کہ یا تو ایسی غلط اندازیوں کو غرض الٰہی سمجھے ہوئے ہیں یا اپنے دل کا بہلاوا سمجھتے ہیں جو ہمیشہ اسی تاک میں رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کسی صاحبِ کمال کا جوہر قابل لوگوں کی نظر چڑھ جائے۔ ہاں یہ وہی لوگ ہیں کہ قلعۂ شہرت کے دروازے پر عصاے منصب داری لیے کھڑے ہیں اور فخر اپنا اس بات میں سمجھتے ہیں کہ جہالت اور عداوت، جو چنگیز و ہلاکو کے تیر و تلوار لیے بیٹھے ہیں، یہ ان کے دربار میں سب سے پہلے عرض پہنچائیں کہ حضور کا شکار حاضر ہے۔

جو لوگ تصنیف کا ارادہ کریں، انھیں ابتدا میں اتنا ضرور چاہیے کہ جو اشخاص نکتہ چینی کے خطاب و القاب سے شہرۂ آفاق بننا چاہتے ہیں، ان کی خدمت میں ایک سفارش کا بندوبست کریں، کیوں کہ ان مردم آزاروں میں بڑے سے بڑا بے درد تھوڑا بہت نرم ہو سکتا ہے، یا کچھ عرصے کے لیے طبیعت کی نیش زنی کو چھوڑنا بھی گوارا کر سکتا ہے۔ میں نے اس تدبیر کی تلاش میں طبع سلیم کی طرف رجوع کی اور عہد قدیم کے بہت پرانے پرانے دفتر اُلٹے، آخر دیکھتے دیکھتے یہ معلوم ہوا کہ کالا ناگ راگ سے پرچ جاتا ہے اور بھونکتا کتا بھی ہڈی سے چپ ہو جاتا ہے۔ آج کل کے نکتہ چیں اگرچہ سانپ جتنے دانت بھی نہیں رکھتے، مگر اس سے بھی سوا زہر اُگلتے ہیں، اور کتے کے برابر بھی نہیں کاٹ سکتے مگر بھونکنے میں اس سے بھی کئی میدان پرے نکل جاتے ہیں۔

پس یقین ہے کہ اس قسم کے طریقوں سے وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ چند اشخاص کے باب میں میں نے سنا کہ بعض تو ایک گلاس شراب اور ایک سیخ کباب پر راضی ہو گئے اور بعض اُن میں خوشامد کے راگوں کی چار تانیں سن کر قابو میں آ گئے۔

لیکن شوق ہمت نے بے ڈھب کام پر کمر ہمت باندھی ہے۔ اگرچہ عقل نصفت اندیش

اُسے دلائل یقینی سے قائل کرتی ہے اور سمجھاتی ہے کہ اس بداندیش نسل کے حملہ ہائے متواتر سے ڈرنا چاہیے، مگر وہ اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہے۔ اب تک صلح کی تدبیر یا راہِ گریز کا خیال بھی نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس مخالفت کا انھوں نے دعویٰ باندھا ہے کہ وہ انھیں قانون مصلحت کی رو سے جائز نہیں، بل کہ یہ اُن کی جعلی حکومت جس کی نہ سند ہے نہ شہادت، اور اسی دعوے پر انھوں نے استاد نکتہ چینی کے خطاب سے حاکم دارالعدالت کی طرح فیصلے کیے ہیں، حق پوچھو تو مجھے یہ بھی صاف دھوکا نظر آتا ہے۔

داستان:

حقیقتِ حال یہ ہے کہ نکتہ چینی، جس کی بدولت ان لوگوں نے مصنفوں کی قسمت کے فیصلے کرنے کا اختیار پایا ہے، اصل میں خواجۂ حق پرست اور محنت خاتون کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو پرورش کے لیے انصاف کے سپرد ہوئی۔ چناں چہ اس نے دانش کے محلوں میں پال کر تربیت کیا۔ وہاں دن رات علوم کی جوہر کاری اور فنون کی مرصّع نگاری کو دیکھا کرتی اور صبح و شام عقل آرائی کے باغوں میں جی بہلایا کرتی۔ جب بڑی ہوئی تو عالمِ بالا کے بزرگوں نے اُسے حسن کمال اور کمالِ حسن میں بے مثال دیکھ کر ملکِ خیال کا تاج سر پر رکھ دیا کہ چند روز کے بعد مملکتِ خیال کی ملکہ ہو کر عالمِ بالا کی پریوں میں داخل ہو گئی۔ وہاں کی پریاں موسیقی، ناچ رنگ، سانگ، شاعری، افسانہ، تاریخ وغیرہ اپنے اپنے فن کی مالک تھیں۔ چوں کہ انھیں بھی ملکِ خیال سے تعلق تھا، اس لیے ملکۂ نکتہ چینی نے اُن کے کلام میں بھی دخل پیدا کر لیا۔ جب انھوں نے عالمِ خاک کی طرف نزول کیا تو ملکۂ نکتہ چینی کہ خود فرماں روائے ملکِ خیال تھی، وہ بھی ان کے ساتھ روئے زمین پر آئی۔ محل سے چلتے وقت انصاف یعنی اس کے اُستاد نے ایک پھولوں کی چھڑی دے دی تھی کہ اسے تمغائے شاہی کی طرح ہر وقت اپنے داہنے ہاتھ میں رکھا کرے۔ عالمِ بالا کے دربار میں دستور تھا کہ جس رات کوئی پری اکھاڑا اچھا کرتی تھی تو اس کی مبارکباد میں اُسے ایک ہار ملا کرتا تھا، جس میں گل ہائے جنت کی کلیاں اور امرت کے درخت کی کونپلیں پروئی ہوتیں۔ چناں چہ عصائے مذکور کے ایک سرے پر وہی ہار اور طُرّے سجا کر انھیں آبِ حیات کے چشمے سے شاداب کیا جاتا اور دوسرے میں سروِ بے ثمر کی پتیاں اور پوست کے ڈوڈے باندھ دیے جاتے۔

یہ دریاے محویّت کے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی، جب سے افیون کا گھولوا اور پوست کا پانی ٹپکتا تھا۔ ملکہ موصوفہ کے بائیں ہاتھ پر ایک مشعل بھی تھی کہ اس کی روشنی کبھی بجھتی نہ تھی۔ اس مشعل کو خود محنت خاتون نے بنایا تھا اور حق پرست نے روشن کیا تھا۔ بڑا جوہر اس میں یہ تھا کہ چیز کیسی ہی مخفی ہو، اس کی روشنی سارا حال جوں کا توں آئینہ کردیتی تھی، بلکہ ہنر کی اُلجھاوٹ اور حمق کی خرابی کام کو کیسا ہی درہم برہم کر کے اُلجھادے، مشعلِ حق کی روشنی پڑتے ہی اس کی سدھاوٹ کا حال بال بال روشن ہوجاتا تھا۔ ظاہر آرائی اور غلط نمائی کے پیچوں میں اس کی شعاع سوئی کی طرح بیٹھ جاتی تھی اور جن جن اینچ پیچ میں ان کے لغویات پیچیدہ تھے، انھیں دفعۃً کھول دیتی تھی۔ بہت سے زرق برق کے لباس کہ فصاحت اور عبارت آرائی نے جھوٹ کے ہاتھ پیچ ڈالے تھے، جو بناوٹ کے کپڑے پہن کر ٹھیک ٹھاک بن بیٹھتی تھیں، انھیں بھی جھٹ پکڑ لیتی تھی۔

غرض ملکہ موصوفہ ایسے ایسے شاہانہ سنگاروں سے سج کر آسمان سے نازل ہوئی تاکہ جو لوگ ان صاحبِ کمال پریوں کے دم بھرتے ہیں اور اعتقاد کا حق زبانِ قلم سے ادا کرتے ہیں، ان کی جانکاہی اور محنتوں کی قدردانی کرے۔ چناں چہ جو کچھ اس کے سامنے پیش ہوتا تھا، اس پر مشعلِ حق کی روشنی سے نظر کرتی تھی اور جب سب طرح دیکھ بھال سے جمع کر لیتی تھی، اور سمجھ لیتی تھی کہ اس تحریر میں قانون درستی پر کماحقہ عمل ہوا ہے تو عصا کا آبِ حیات والا سرا چھوکر اجراے دوامی کا حکم چڑھا دیتی تھی۔ اس سے آبِ حیات کی شبنم برستی تھی اور تصنیف مذکور کو خاص و عام میں رواج دوام ہوجاتا تھا، لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو کتابیں اُس کے سامنے پیش ہوئیں، ان میں دیکھا کہ بہت سے مضامین بے اصل ہیں، بل کہ غل فصل کے مطالب خرچ ہوئے ہیں۔ البتہ محنت نے ان پر جھوٹ موٹ کے زنگ و روغن چڑھا کر رنگ آمیزی کی ہے، مگر پھر بھی الفاظ و مطالب ٹھیک ٹھیک مطابق نہیں بیٹھے یا فکر صحیح نے مطلب اصلی سے درست جوڑ نہیں کھایا یا کچھ کچھ واہیات ژٹلیں احمقوں کے خوش کرنے کو لکھ دی ہیں، یا کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے بے قاعدہ مطالب درج کردیے ہیں کہ ان میں لطفِ مضامین ہے نہ بات کی پختگی ہے، نہ کچھ زیادہ فائدہ مند ہے۔ غرض جہاں کوئی بات کھٹکتی ہے (اور ایسی چوک اس پر کھل تو جاتی ہی تھی) پس وہاں ملکہ نکتہ چینی اس سرے کے چھونے سے انکار کرتی تھی، جس سے تصنیف مذکور کے رواج کو استقلالِ دوام ہوجائے، بل کہ جس

میں بہت سی موٹی موٹی غلطیاں دیکھیں تو اسے عصا کے دوسرے سرے سے ٹھکرا کر ہٹا دیا۔ یہ پوست کے کتاب مذکور آہستہ آہستہ محو ہونے لگتی تھی، اور جس طرح کوئی افیونی نشے کے رنگ میں او نگھتے او نگھتے تحت الثریٰ پہنچ جائے، اسی طرح تھوڑے ہی عرصے میں بالکل نیست و نابود ہو جاتی تھی۔ چند روز کے بعد کسی کو خبر بھی نہ رہتی تھی کہ کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ کئی کتابیں ایسی بھی نکلیں کہ انھیں دیکھ کر ملکہ متردد ہوئی اور اپنی چھڑی کہ در حقیقت عدل کی ترازو تھی، بیچوں بیچ سے پکڑے کھڑی رہی، اور دیر تک سوچتی رہی۔ چناں چہ رفتہ رفتہ ایسی کتابیں اس کثرت سے جمع ہو گئیں کہ ملکہ ان کے مشکوک دعووں اور بے جا سفارشوں پر توبہ کرتے کرتے تھک گئی۔ آخر بہ نظر احتیاط کہ مبادا انصاف کی چھڑی بے جا کام میں آئے، ان کے مقدمے کو وقت کے حوالے کر دیا، کہ وہ خود بخود اُن کے بُرے بھلے کی حقیقت کھول دے گا۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ تصانیف مذکور دعووں کے زور اور سفارشوں کی قوت سے چاردن کی چاندنی کی طرح چند روز رہیں گی، مگر ایک زمانے کے بعد خود بخود سب کو معلوم ہو جائے گا کہ کتنا اندھیرا اور کتنا اجالا ہے۔

وقت کے کاروبار سُست تو تھے، اور شروع میں کچھ باتیں واہیات بھی معلوم ہوتی تھیں، مگر اور سب باتوں میں اس کی رائے بالکل انصاف سے متفق ہوئی۔ بعض اشخاص ایسے بھی تھے کہ اُن کی تصنیفات پر جو چھڑی کے چھونے میں کچھ توقف ہوا تو اس سے اُنھوں نے سمجھ لیا کہ ہم بالکل کام یاب ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کتابیں بغل میں مارے رواجِ دوام کے یقین میں خوشی خوشی رمانِ آیندہ کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ مگر زمانہ گذراں کی درانتی کے نیچے اُنھیں بھی گھسنا کھانا پڑا، اور ایک زمانۂ معہودہ کے بعد خود بخود کٹ کٹ کر گر پڑے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض تصنیفات تو آہستہ آہستہ کٹ کر برباد ہوئیں، اور بعض ایک ہی رگڑے میں دو ٹکڑے ہو کر فنا ہو گئیں۔

ملکہ نکتہ چینی بہت دیر تک وقت کے عملدر آمد کو دیکھتی رہی، اور آخر کار اُس کے کاروبار سے مطمئن ہو کر اپنے اُستاد خدا وندِ انصاف کے ساتھ دنیا سے چلی گئی، مگر یہ غضب ہوا کہ غلط فہمی اور ہٹ دھرمی کو عداوت، دغا اور خرابی کی رفاقت میں کھلا چھوڑ گئی کہ جس کی محنت اور جانکاہی کو چاہیں بے دھڑک برباد کیا کریں۔ بل کہ اب تو ملکہ نے اتنی ہی بات پر اکتفا کیا ہے کہ وہ دور سے بیٹھی

تماشا دیکھا کرتی ہے، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جو دل علم کے فیض اور نیکی کے نور سے اثر پذیر ہیں، اُن تک اپنا فیض پہنچاتی ہے۔

اکثر نالائقوں کی بدتمیزی کے سبب سے ملکہ چلتے وقت خفا بھی ہوئی اور اپنے عصا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُچھال دیا۔ چناں چہ آبِ حیات والا ٹکڑا تو خوشامد اور چاپلوسی نے اُچک لیا تھا اور دوسرا سرا جو آبِ محبت سے آلودہ ہو رہا تھا، وہ عداوت نے لپک لیا تھا۔ چاپلوسی جسے آبِ حیات والا سرا ہاتھ آیا تھا، اس کے مرید اور غلام بہت سے موجود تھے، مگر اُن کے پاس نہ تو روشنی موجود تھی، نہ وہ روشنی چاہتے تھے۔ اسی واسطے اچھے برے کا خیال نہ کیا۔ کبھی تو زبردست کے دباؤ سے، کبھی دنیا کی طمع سے، کبھی اپنے لطفِ طبع کے لیے جو کچھ کوئی پیش کرتا اُسے آبِ حیات والا سرا چھوا دیتے۔ ادھر عداوت کے چغل خوروں سے بڑی راہ تھی۔ انھوں نے اُسے ایک لالٹین تیار کر دی تھی، کہ روشنی اس کی ایک رخی تھی، یعنی فقط برائیوں پر ہی پڑتی تھی، خوبیاں بالکل نظر نہ آتی تھیں۔

دشمنانِ تیرہ دل کی تیرگی کو کیا لکھوں
جس قدر دیکھو ہوا، اُتنا سوا اندھیر ہے

غرض یہ کہ چاپلوسی اور عداوت دونوں کے مرید اپنے اپنے سونٹے کے زور پر اپنی اپنی ملکہ کے اجراے احکام کے لیے عالم میں پھیل گئے کہ جسے چاہیں عمرِ دوام بخشیں اور جسے چاہیں ایک دم میں فنا کر دیں، مگر اب اس ٹوٹی پھوٹی چھڑی کی بھی طاقت بالکل جاتی رہی ہے، وقت اُن کے فیصلے کا ذرا لحاظ نہیں کرتا، جو چاہتا ہے بے لاگ حکم چڑھا دیتا ہے، اور وہی تمام عالم میں حاوی ہو جاتا ہے۔ آؤ دوستو! اُسی کی راہِ انتظار پر بیٹھ جاؤ۔

مرقعِ خوش بیانی

خوش بیانی کا مرقع اور فصاحتِ اصلی و نقلی کی جنگ:

جس شغل میں مدت تک انسان کی دل لگی رہی ہو، اس سے بالکل دل کا اُٹھالینا بہت دشوار ہے۔ ہر چند دل کو اس کی یاد سے حرکت نہ دیں، مگر اس میں آپ ہی آپ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے سمندر میں مدو جزر آ کر ٹھہر جاتا ہے، اور ہوا کے جھونکے بھی تھم جاتے ہیں، مگر پانی گھڑیوں پڑا لہرایا کرتا ہے۔ اسی طرح آج مجھے خیال ہوا، یعنی پچھلی رات باقی تھی، جو بیٹھے بیٹھے نیند آگئی۔

اس عالمِ خواب میں خوش بیانی کا ایک مرقع مسلسل میری آنکھوں کے سامنے سے گزرا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خوش بیانی اصلی یا نقلی یا دونوں سے مرکب تھی، مگر ایسا معلوم ہوا کویا مجھے ایسی سر زمین میں لے گیا ہے، جو دنیا کے عجائب وغرائب سے مالا مال، بل کہ سحر کاری اور نیرنگ سازی سے بھری ہوئی ہے۔ اس ملک میں ایک ملکہ کی حکمرانی تھی، جسے وہاں کے لوگ ملکۂ سخن آرا سمجھتے تھے، مگر دنیا کے لوگ خوش بیانی بے معنی مشہور کرتے تھے۔ دیکھتا ہوں کہ باغ سے شہر اور شہر سے اُجاڑ تک بل کہ کھیت سے جنگل اور جنگل سے پہاڑ تک، کوئی شے ایسی نظر نہیں آئی جو ذرا اصلیت کا رنگ رکھتی ہو۔ بعضے درختوں پر سونے روپے کے پتے لہلہاتے تھے، بعضوں پر تاش تمامی کے پھول جگمگاتے تھے، ٹہنیوں میں گوہر یکتا اور جوہر بے بہا آویزاں تھے، فواروں میں گلاب اور بید مشک اُچھلتا تھا اور اس کی دھاروں میں سریلی آوازیں لہراتی تھیں۔ جنگل کی گود کے پالے، ہرنیاں اور باڑے صحرا کے دامن میں لوٹ رہے تھے۔ دریا کے پیارے یعنی آبی جانور اور رنگین رنگین مچھلیوں کے لچھے نہروں میں جھلملا رہے تھے۔ پرندے بھی بے شمار تھے، مگر اکثروں کی چونچیں سنہری تھیں، اکثروں کے باز و ہیرے یاقوت سے تراشے تھے۔ اس پرنغمہ سنجی کا یہ عالم تھا

کہ ان کے سامنے شعرا کی غزل خوانی کا دم بند ہوتا تھا۔ پھولوں نے ہوا کو عبیر و لوبان، مشک و زعفران سے بسا رکھا تھا۔ عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں اور یہ ملی جلی خوشبوئیاں الگ الگ ایسی کیفیتیں دیتی تھیں، گویا روشن ہوا پر گل کاری کے تختے کھلے ہوئے ہیں۔ باد جو داس کے صبا دنسیم کے دامن عاشقانِ مہجور کی آہوں سے بھرے ہوئے تھے، اور جو موج ہوا تھی، حسرت زدوں کے پیاموں میں اُلجھی ہوئی تھی۔

میں اس دشت سحر نگار میں ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخر اُن عجائبات کو دیکھ کر مجھ سے بولے بغیر نہ رہا گیا اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا، مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو میری آواز گونج کر پلٹتی تھی، وہی میری باتوں کا جواب ہوتی تھی۔ باد جو داس کے کبھی اتفاق کرتی تھی، کبھی تردید کرتی۔ غرض ان دیکھے ہم راہیوں کے ساتھ باتیں کرتا چلا جاتا تھا، جو ایک غار کے سرے پر پہنچا۔ دیکھوں تو اندھیر گھُپ ہے، آگے بڑھا تو ذرا آنکھیں روشن ہوئی اور معلوم ہوا کہ ایک عمارت عالی شان بنی ہوئی ہے۔ اس کے دروازے پر جو اشعار سونے کے حرفوں سے لکھے ہوئے تھے، ان سے معلوم ہوا کہ یہ خیال پرستوں کا مندر ہے، اور ایک دیوتا مہاراج اس کے دروازے پر بیٹھے ہیں کہ عالم حماقت کے فرماں روا ہیں۔ سر پر دستار سر گردانی ہے اور تاج کی جگہ ایک سروسر پر باندھ لیا ہے۔ قلندرانہ لباس پہنے ہیں۔ ایک ہاتھ میں کتاب لیے ہیں، دوسرے میں جھنجھنا ہلاتے ہیں داہنے ہاتھ کی طرف محنت بیٹھی عرق ریزی کر رہی ہے اور آگے چراغ جل رہا ہے۔ بائیں ہاتھ پر تلون مزاجی کھڑی ہر دم نیا رنگ بدل رہی ہے۔ کندھے پر ایک عجیب الحرکات یعنی بندر بیٹھا اُچھل رہا ہے۔ وہ کبھی جھک جھک کر سلام کرتا ہے، کبھی منہ چڑانے لگتا ہے، کبھی ٹہنیاں ہلانے لگتا ہے۔ اس کے پیش قدم بھینٹ چڑھانے کی جگہ عجیب ڈھنگ کی بنائی تھی اور پیچھے معلوم ہوا کہ فی الحقیقت وہ ایسی ہی تھی، جیسا اُس کے گرد لکھا ہوا تھا۔ بہت سی بھینٹ اور قربانیاں وہاں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اکثر صورت ہائے بے معنی کے جانور وہاں لٹکتے تھے، جن کا نام اُن کے معتقدوں نے نازک خیالی اور رنگین بیانی رکھا تھا۔ یہ جانور حروف بے آواز اور آواز بے حروف کے زمزمے بھرتے تھے، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ سراسر مضمون مدعا غائب۔ بہت سے تشابہ صورت کی طوطیاں اور غلط نما بلبلیں تھیں کہ کبھی نظر آتی تھیں، کبھی غائب ہو جاتی تھیں۔ اکثر نیم بسمل پڑے تڑپتے تھے۔ معلوم ہوا کہ

تشبیہوں اور استعاروں کا گنج شہیداں یہی ہے۔ وہیں ایک مجلس نظر آئی، جس کے اہلِ محفل میں کسی کی ایک آنکھ، کسی کی دونوں آنکھیں بھینگی تھیں، جو بھینگے نہ تھے وہ طاقی تھے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے تجنیس اور ایہام وغیرہ صنعتوں پر اپنی آنکھیں قربان کر دی ہیں۔ ایک طرف زمینِ شعر میں درخت بنا کر کھڑے کر دیے تھے، مگر ثمر اصلا نہ تھا اور ثمر تھا تو مزے دار نہ تھا۔ یہ مندر ان کے پجاریوں اور مہنتوں سے بھرا ہوا تھا، جن کی آنکھیں تو بند تھیں مگر وہم و وسواس اُنگلی پکڑے انھیں لیے پھرتے تھے، اور جن شغلوں میں لگا دیتے تھے انھی میں لگ جاتے تھے۔ ایک طرف ایک پلٹن تھی، فقط ہیرے پھیرے کو تی تھی، اس کا نام قواعد رکھا۔ کبھی ننگے سر ہو جاتے تھے، کبھی ننگے پاؤں ہو جاتے تھے، کبھی ایک ننگے سر اور ایک ننگے پاؤں ہو کر اگنڈے دار ہو جاتے تھے۔ کبھی اکہرے ہو جاتے تھے، کبھی دوہرے ہو جاتے تھے، کبھی سب گلے میں باہم ہاتھ ڈال کر لوٹ جاتے تھے۔ اضطراب اور گھبراہٹ نے ایک غلط سلط کتاب بنا کر اُن کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ اسی کے بموجب ان کی قواعد تھی۔ آگے دیکھتا ہوں کہ ایک مجمع ایسا کھڑا ہے گویا دربار کو جاتا ہے۔ اتنے میں ایک ننگا آدمی آیا اور برابر سب کی پگڑیاں اُتارتا چلا گیا کہ اپنے لیے کپڑے بنائے۔ معلوم ہوا کہ شاعر ہے، ابجد کا عمل کر کے کسی بادشاہ کا نام نکال رہا ہے۔ اُن سے آگے اور بھی اعلا درجے کے لوگ نظر آئے۔ دیکھتا ہوں کہ بہت سی کرسیاں بچھی ہیں، اُن پر کچھ اشخاص کھڑے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں ایک ریت گھڑی ہے کہ وقت کا اندازہ بتائے، کسی نے ایک دائرہ کھینچ کر ہاتھ میں لے لیا ہے اور منہ سے نفیری بجا رہا ہے، مگر بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم ہوا کہ ایک امیر کا بیاہ ہوا ہے اور ایک کے گھر لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ اُن کی تاریخیں کہہ رہے ہیں اور ایک طرف دیکھتا ہوں کہ دو رُخے انسان بیٹھے ہیں، مگر منہ سے کچھ نہیں بولتے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایسے فقرے اور شعر ہیں جو اُلٹے سیدھے دونوں طرف سے پڑھے جاتے ہیں مگر لطفِ معنی ندارد۔

مندر کی مغربی جانب میں دیکھا کہ چند اشخاص نہایت محنت کے کام میں مصروف ہیں اور بہت سے ڈھیر ان کے آگے پیچھے پڑے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ صاحب! کیا کر رہے ہو؟ بولے کہ معمّوں کا ذخیرہ تیار کر رہے ہیں، کیوں کہ دیوتا کو اس سے زیادہ کوئی بھینٹ نہیں بھاتی۔ ان ڈھیروں میں ایسی طرح بہ طرح کی چیزیں تھیں کہ ایک کو دوسری سے نسبت نہ تھی۔ بہت سی گڈیاں

بھی بندھی تھیں اور لکڑی کے انبار کی طرح اوپر تلے پڑی تھیں۔ انھی میں ایک جگہ لنگر لنگوٹے، ایک طرف جتے اور عمامے، پھر انھی میں پشواز اور پاؤں کے گھنگرو، چھوٹی بڑی تھیلیوں اور پوٹلیوں میں بندھے انم گلے ہوئے تھے۔ ایک گٹھڑی میں سے ایک کاٹھ کے گھوڑے کا سر بھی نکلا ہوا تھا۔ میں وہاں سے گھبرا کر چلا۔ اتنے میں ایک کاریگر نے مجھے متحیر دیکھ کر پکارا کہ جناب! ایک پوٹلی میں گنج کے گنج نازک خیالیاں ہیں، اگر آپ کہیں تو دکھاؤں؟ میں نے سلام کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ معاف کیجیے، اس وقت مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے۔

میں مندر سے باہر جاتا تھا، جو دیکھا بہت سے آدمی آگے پیچھے، بے ترتیب ایک جگہ جمع ہیں، مگر آمنے سامنے بیٹھے پٹاپٹ قافیہ بازی کر رہے ہیں۔ اپنی تک بندی پر آپ ہی خوش ہوتے ہیں اور تفاخر کی ٹوپیاں اُچھالتے ہیں۔ ابھی ان کے پاس ہی تھا، جو دیکھا کہ آگے دوہری دوہری تہری تہری تک بندیاں ہو رہی ہیں۔ انھیں سن کر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ان کے پاس ہی دیکھا کہ بہت سے خندہ جبیں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، مگر جسے دیکھتے ہیں، اُسے کوئی اور شخص سمجھ کر ہنسنے لگتے ہیں، اور ایسی مسخرے پن کی غلطیاں کرنے کے لیے جوڑی جوڑی ہو گئے تھے۔ ہر جوڑی سر سے پاؤں تک ایک ہی لباس پہنے ہے، مگر اصل میں ایک کو دوسرے سے مناسبت بھی نہیں۔ کبھی کبھی بوڑھے پر اٹم کو لڑکا فرض کر لیتے ہیں، کبھی مرد کو عورت سمجھ لیتے ہیں اور اس پر آپ ہی آپ خوش ہو ہو کر واہ واہ کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ معنون کا جمگھٹ ہے۔

جب ان طلسمات کو دیکھتے دیکھتے میرا سر پھر گیا تو گھبرا کر وہاں سے نکلا۔ باہر دو چار کھیت آگے بڑھا تھا جو دفعتاً ایک ہیبت ناک غل اور ساتھ ہی طبل جنگ کی آواز آئی، اور ایسا معلوم ہوا گویا کوئی فوج جنگی چڑھی آتی ہے۔ آخر جو میں نے قیاس کیا تھا وہی نکلا؛ یعنی دور سے ایک روشنی کا غبار نمودار ہوا۔ اس کے درمیان میں ایک مرد باوقار صاحبِ شکوہ سر پر اعزاز کا تاج رکھے، گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے۔ جو اُسے دیکھتا تھا، کہتا تھا کہ سچ ہے اور برحق ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اس کا فرزند دل بند خراماں خراماں آتا تھا۔ پشت پر بہت سے ترکش لٹکتے تھے، ہاتھ میں چڑھی کمان اور کمان میں تیر جوڑ رکھا تھا، اس کا نام حسنِ بیان تھا۔ جوں ہی ان دونوں کے آنے کی خبر اُڑی، ظرافت بے معنی کے تمام ملک میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ عالم حماقت کے دیوتا یعنی اُوت مہا

بھوت بذاتِ خود اپنی ایک کالی گھٹا کے رنگ میں فوج لے کر اُٹھے۔ بادل کی طرح گرجتے اور مینہ کی طرح برستے سرحد پر آن موجود ہوئے اور جن جن نامعقولوں کو میں نے مندر میں دیکھا، وہ انبوہ بے تمیزی اندھیری رات کی طرح ایک لشکر کی صورت میں نمودار ہوئے، اور جھٹ صفیں باندھ لیں کہ دشمن کا آگا روکیں۔ جو جو معتقد جان نثار تھے، انھیں حکم پہنچا کہ گھوڑے اُڑا اُڑا کر سامنے اُچھلو اور لغات کی لفاظی اور مبالغوں کی دھوم دھام سے غل مچاؤ کہ حریف سنتے ہی ڈر کر بھاگ جائے۔ چوں کہ حریف بہت آہستہ آہستہ کوچ کر رہا تھا اس لیے یہاں کے سرحدی لوگوں کو بھی موقع مل گیا کہ اپنی بھیڑ اکٹھی کر کے الگ کھڑے ہو جائیں اور اُس وقت کے منتظر رہیں کہ اخیر کو میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

شائقینِ سخن ذرا اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ سرحدی ملک خوش بیانی مرکب کے فرقہ ہائے مختلفہ سے آباد تھا، یعنی کچھ اصل کچھ بد اصل۔ چناں چہ ان کی فوج کی عجیب شان تھی؛ مردوں کے جسموں پر برچھیاں چبھی ہوئی تھیں، عورتوں کی آنکھوں کی جگہ آتشی شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر مردوں کے دل انگارے تھے، تو عورتوں کی چھاتیاں برف کی تھیں۔ غرض کہ جیسے عجائب و غرائب مخلوقات سے یہ لشکر آراستہ تھا، اُس حالت کی رنگارنگی بیان کے احاطے میں محصور نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ جس وقت حریف کا نشان نمودار ہوا دفعتہً اُن میں ایک ہلچل مچی، اور فوراً دو حصّے ہو کر، ایک حصّہ سچ کے سایۂ علم میں جا گھڑا ہوا، دوسرا اُوت مہا بھوت یعنی چھوٹے دیوتا کے نشان کے نیچے ہو گیا۔ دیوِ دروغ اپنا کالا پہاڑ سا ڈیل ڈول لیے چند قدم آگے بڑھا، مگر جوں ہی سچ کی روشنی اس پر پڑنی شروع ہوئی، وہ اس طرح بے معلوم تحلیل ہونا شروع ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں اصلی جسم کی جگہ فقط ایک پرچھائیں سا نظر آنے لگا۔ آرا دھر سے سچ بھی آگے بڑھا۔ جب اس کی روشنی پاس آئی تو وہ دیوِ روسیاہ بالکل نیست و نابود ہو گیا اور جہاں کالا پہاڑ تھا وہاں خاک سی اُڑ کر رہ گئی۔

تم نے آفتاب کو دیکھا ہوگا کہ جوں جوں نکلتا آتا ہے، چھوٹے موٹے تارے برابر چھپتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا نقشِ وجود سامنے کے نصف کرّے سے بالکل محو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں معلوم ہوا کہ دیوِ دروغ یعنی اُوت مہا بھوت تو بالکل نیست و نابود ہو گئے، اور نہ فقط دیوِ دروغ بل کہ سارا لشکرِ شیطان جو ہمدردی اور جاں نثاری کو حاضر تھا، دم میں ہوا ہو گیا۔ طلسمِ باطل کا مندر

زمین میں غرق ہو گیا، مچھلیاں دریاؤں میں چلی گئیں، پرندے چڑیوں کی طرح اُڑ گئے، جنگلی حیوان جنگلوں میں چلے گئے اور اب زمانے نے نئے سرے سے اصلی رنگ بدلا؛ یعنی چشموں کی روانی، مُرغِ خوش الحان کے چہچہے، پھولوں کی خوشبوئیں، روئے زمین کی سرسبزی نے سچا رنگ نکالا، اگرچہ میں ابھی پڑا سوتا تھا، مگر اس عالم میں ایسا معلوم ہوا کہ اب خوابِ غفلت سے میری آنکھ کھل گئی، اور اُن طلسمی عجائب و غرائب کی جگہ پر سرسبز جنگل، اصلی نہریں، ہری بھری کیاریاں ہو گئیں۔

جن شعبدوں کے اچنبھے نے میری عقل و حواس کو درہم برہم کر دیا تھا، جب وہ سامنے سے دُور ہوا تو میں نے خوش بیانی اور صداقت کے جلوے کو نظرِ غور سے مشاہدہ کیا، کیوں کہ انسان ایک چیز سے نظر اُٹھائے بغیر دوسری چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ چناں چہ اُن کے بعد مجھے ایک انبوہ نظر آیا، جن میں شاہنامہ کی بحرِ تقارب، فردوس کے پھولوں کا تاج سر پر رکھے شمشیر برہنہ علَم کیے کھڑی تھی۔ خاقانی قصائد کے تاتار میں خاقانِ چین بنا ہوا تھا۔ پہلو میں انوری اور بدر چاچی مضامین سے نُور اُڑا رہے تھے۔ خاص خاص قسم کی مثنویاں، غزلیں اور رباعیاں اپنے اپنے درجے سے اس کے دائیں بائیں اور پس و پیش آراستہ تھیں۔ نثر اپنے پیادوں کی صفیں باندھ رہی تھیں۔ مرثیوں کی نظم و نثرِ غم ناک، سنبل سے بال بکھیرے، جامۂ خون آلود پہنے خاموش کھڑی تھی۔ ہجو کے ہونٹوں پر تبسم تھا، مگر خنجر زیرِ قبا لیے کھڑی تھی کہ جدھر موقع پاؤں گی، ہرگز نہ چوکوں گی۔ فصاحت کا علَمِ نصرت بلند تھا، اور اس سے پہچانا جاتا تھا کہ بجائے پھریرے کے اس پر بجلی کوند رہی تھی۔ اس سارے مرقّع کے پیچھے لطائف و ظرائف بھی نسیم و صبا کی طرح خراماں خراماں پھر رہے تھے، اور درحقیقت مہم کے شروع ہونے سے پہلے انھیں یہاں جمایا تھا کہ ایسا نہ ہو دشمن سے جا ملیں۔ کیوں کہ وہ دلوں سے ایک نگاہ ادھر بھی رکھتے تھے، ابھی کے پہلو میں مشاعرہ کا جلسہ تھا اور حافظ اور سعدی کی غزلوں سے شرابِ شیرازی کا دور چل رہا تھا۔ سلطان خوش بیان کے ظہور سے میرے دل پر ایک ہیبت طاری ہوئی، مگر ساتھ ہی خوشی کا بھی اثر ہوا۔ اس کی نگاہ موہنی تھی کہ دل سے پیار آتا تھا، مگر ساتھ ہی ایسی تیز بھی کہ دل کانپا جاتا تھا۔ میں اس کی طرف نظرِ غور سے دیکھ رہا تھا کہ اُس نے اپنے تیروں کا ترکش لے کر مجھے دھوکا دینے کا اشارہ کیا۔ میں نہایت خوش ہوا اور اس کے لینے کے لیے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا، مگر ہاتھ جو کرسی سے ٹکرایا، دفعتاً آنکھ کھل گئی۔

سیرِ عدم

مسافرانِ عدم کے پسماندوں کی سرگزشت:

جب کوئی نہایت چاہتی چیز ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور معلوم ہوا، کہ اب ہاتھ نہ آئے گی، تو کیا دل بے قرار ہوتا ہے، جان صحرائے تصور میں کیسی اس کے پیچھے بھٹکتی پھرتی ہے، مگر جب تھک کر ناچار ہو جاتی ہے تو اُداس بے آس ہو کر آتی ہے اور اپنے ٹھکانے پر گر پڑتی ہے۔ عقل وفہم البتہ دلِ غمگین کو سہارا دے سکتے ہیں، مگر دل ایسا بھولا بھالا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا، اور جو غذا اُس کے جی کو بھاتی ہے، اُسی کو ڈھونڈتا ہے۔ درحقیقت یاد، جو دل کی ہمسائی ہے؛ وہ ہمیشہ غم کو خانۂ دل میں بلاتی ہے، اور ایّامِ گزشتہ میں جو مزے اُٹھائے ہیں، یا دولت کھو کر عیش اُڑائے ہیں، اُن کی گزری ہوئی بہاروں کے افسانے سناتی ہے۔ کسی کو اس دولت وعظمت کا غبار اُڑتا دکھاتی ہے، جس کی سواری گزر گئی۔ کسی کو اقربا کی آوازیں اور دوستوں کی باتیں سناتی ہے جو شہرِ خموشاں میں پڑے سوتے ہیں۔ کبھی عزیزوں کی صورتوں اور اُن کی طبیعتوں کی تصویریں دکھاتی ہے، کبھی پیاروں کے پیار اور ان کی محبتوں کے افسانے سناتی ہے۔ دل نے حسرت واشتیاق کو بھی اپنے گوشے میں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ ان باتوں سے ایسے پھولتے اور پھلتے ہیں کہ دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، مگر زمانہ اور اُس پر وقت کا گزر جانا حالاتِ مذکورہ کو کچھ کچھ کمزور کرتا ہے۔ ساتھ اس کے یا تو عقل وفہم آ کر حسرت واشتیاق کو دباتے ہیں، یا کوئی اور باہر کا شوق اُن سے بھی زبردست آتا ہے، وہ اُن کا رتبہ گھٹاتا ہے۔

میں انھی خیالات میں پڑا ہوا تھا جو نیند آ گئی۔ دیکھتا ہوں کہ گویا ایک چٹیل میدان، صحرائے بیابان، سمندر کا کنارہ ہے اور میں وہاں، بہت سے لوگوں میں کھڑا ہوں کہ جن کے سوگوار چہرے اُن کے دل کے غم واندوہ کی گواہی دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے دریا بہہ رہا تھا، اُس کا چپ چپ

بہاؤ اور سناٹے کا چڑھاؤ پکار رہا تھا کہ یہاں تھاہ کا پتا نہیں۔ اس دریا کو دریاے اشک کہتے ہیں۔ اُسی دریا میں ایک ٹوٹی پھوٹی سی کشتی بھی پڑی ہوئی تھی۔ چناں چہ معلوم ہوا کہ بہت سے مسافر پار جانے والوں نے اضطراب اور بے صبری سے اس میں بیٹھ بیٹھ کر اُسے خراب کر دیا ہے۔ مصیبت اس کشتی پر ملاحی کرتی تھی۔ چناں چہ وہ فوراً ہمارے پاس لے آئی۔ ہم بھی سوار ہونے کو تیار تھے کہ اتنے میں ایک بی بی دیرینہ سال شرم و حیا کا برقع اوڑھے، حلم کی لاٹھی ٹیکتی آئی۔ شفقتِ مادرانہ سے ایک ایک کا نام لے کر پکارا اور سفرِ دریا کے خطر بیان کرنے لگی تا کہ ہم کسی طرح اپنے ارادے سے باز رہیں۔ اکثر لوگوں نے اُسے پہچان لیا کہ بی بی صابرہ خاتون ہیں۔ چناں چہ بعض اشخاص جو رو رو کر آنکھوں سے دریا بہا رہے تھے، انھوں نے اس کا کہنا مانا اور پیچھے ہٹ آئے۔ باقی ہم میں سوار ہوئے۔ بڑھیا بے چاری کی نیک ذاتی اور اس کے دل کی دردخواہی نے مصیبت زدوں کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا اور کہا ”اے فرزندو! اگر تم کہو تو میں بھی تمھارے ساتھ سوار ہوؤں کہ بھلا اگر سفر میں دقت پڑے تو تمھیں تسکین یا صلاح مناسب تو دے سکوں۔“

غرض کہ ہم کشتی میں سوار ہو کر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ کشتی چل نکلی اور بادبان کھل گئے، مگر ان بادبانوں میں فقط آہوں کا دھواں بھرا تھا، کیوں کہ اس ملک کی ہوا یہی تھی۔ رستے میں اگر چہ بہت سے صدمے تہلکے اٹھائے، مگر اکثر لوگ ہم میں ایسے تھے کہ انھیں اس کی پروا ہی نہ تھی۔ غرض بہ ہزار دقت کشتی کنارے پر لگی۔ جب پار اترے تو دیکھا کہ ایک جزیرہ ہے مگر وہاں ایسی دھند چھائی ہوئی تھی کہ سورج نے اپنی شعاعوں کے ہزاروں تیر مارے، ایک پار نہ جا سکا، سامنے ایک بھیانک اندھیرا اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ جو لوگ ہم میں ذرا دلوں کے نرم تھے وہ اس مقام کو دیکھ کر سخت گھبرائے اور ناچار ہو کر صبر کے دامن کو ہاتھ لگایا۔ چناں چہ اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر ادھر اترے۔ پھر یہ بھی ہم نے سنا کہ اس کے پتے کے بموجب جزیرے کی سرحد پر پہنچ کر انھیں ایک پایاب مقام ہاتھ آ گیا۔ میں ابھی تک انھیں لوگوں کے ساتھ تھا جن کا یہ ارادہ تھا کہ جزیرے کے بیچوں بیچ میں ہی جا کر دم لیں گے، چناں چہ وہ سب نہایت آہستگی اور سنجیدگی سے، جیسے کوئی جنازے کو لیے جاتا ہے، چلے جاتے تھے۔ انھیں ہم سفروں کے حلقۂ رفاقت میں میں بھی چلا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک سرسبز بن میں جھاڑیوں کے اندر اندر چلے جاتے ہیں، اور

ان درختوں کو قبرستان پر ہی سایہ کرنے کا عشق ہے۔ یہاں کچھ آدمی بھی رہتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، مگر وہ بھی نالہ وزاری میں مصروف تھے کہ کسی طرح انھیں تسکین نہ ہوتی تھی۔ کوئی شاخِ درخت کو پکڑے کھڑا تھا اور زار زار رو تا تھا، کوئی اپنے ہاتھ کو مروڑتا تھا اور دل مسوس کر رہ جاتا تھا، کوئی چھاتی پیٹتا تھا اور بال نوچتا تھا، کوئی خاموش کھڑا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا صدمۂ غم سے سکتے کا عالم ہو گیا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر اور آوازوں کو سن کر ہمارا غم اور بھی زیادہ ہوا۔ بل کہ ایک رفیق تو ایسا بے تاب ہوا کہ رستے پر ایک درخت کا ٹہنا جھکا ہوا تھا، اُس نے ارادہ کیا کہ اس میں لٹک کر رہ جائے، مگر ساتھیوں نے تسلّی دلاسا دے کر سنبھالا۔

اب ہم چلتے چلتے ایسے مقام پر پہنچے کہ زمین آسمان اندھیر اور بالکل سنسان مقام تھا۔ جنگلی کی سائیں سائیں، ٹہنی ٹہنی سے رونے کی آواز، ہوا کا گھٹاؤ، دلوں کے دھڑ کنے سے جب ہمارا حال بہت ابتر ہوا تو سب کو یقین ہو گیا کہ اب ہم کنجِ غم کے پاس آپہنچے۔ ایک گہری گھاٹی کے بیچ میں اندھیرا گھپ ایک لمبا غار تھا۔ اسی کے رستوں کے اینچ پینچ میں کچھ کچھ پانی بھر رہا تھا، مگر عجب رنگت پائی تھی کہ نہ کالی نہ لالی، وہی نیلا پیلا کیچڑ پانی تھا کہ نالہ وزاری کی آوازوں پر آہستہ سرسراتا تھا، اور مارے غم کے دل کے لہو کو پانی کر کے بہتا تھا۔ غارِ مذکور کے اندر ایک تہ خانہ تھا جس کے دروازے پر آہ کے قلم اور تیرہ بختی کی سیاہی سے لکھا تھا کہ ''کلبۂ احزان کا دہان غم یہی ہے۔'' اندر اس غارِ مصیبت کے دیو غم انجام کا وجود بدنمود نظر آتا تھا۔ اس کے رستے میں کوڑا، کانٹے اور سانپ بچھوؤں کے ڈنک بکھرے ہوئے تھے۔ جس تخت پر اس کا جلوس حاکمانہ تھا وہ ایک ٹوٹی پھوٹی پہاڑی کی چٹان تھی۔ تکیوں کی جگہ پیچھے اور پہلوؤں میں کئی کڈ ھنگے بے ڈھنگے پتھر ڈال دیے تھے۔ سر پر تاج بے کلاہی دھرا تھا، جس پر اندھا دھند اندھیرا چھایا ہوا تھا اور بارِ غم کے مارے سر کو بازو پر سہارا دیے ہوئے تھا۔ اس شان سے اپنی غم پرست دنیا آئین رعایا پر حکمرانی کرتا تھا اور افسردہ، پژمردہ، چپ چاپ، خاموش خود اپنے خیال میں گم ہو کر حماقت کی تصویر بن گیا تھا۔ اس کے ایک طرف ملامت وافسردگی کھڑی تھی کہ مارے ضعف کے جھکتے جھکتے نقشِ زمین ہو گئی تھی، لوگ کہتے تھے کہ غش آگیا۔ دوسری طرف فکر تھا کہ دم بہ دم کی سرگوشی سے ہزاروں وہم وسوسوں کے عذاب میں گرفتار تھا۔ زردی سر پر کھڑی رومال ہلاتی تھی کہ رنگ دھواں ہو کر اُڑے جاتے

تھے۔ پہلو میں درد بیٹھا تھا کہ جونک کی طرح اندر لہو پیے جاتا تھا۔ تمام غم خانے میں ویرانی بربادی چھائی ہوئی تھی، اور اس کھنڈر کے چھیدوں میں کئی چراغ سحری بھی ٹمٹمارہے تھے، جن کے نیلے نیلے شعلے اٹھتے تھے اور اپنی ہی نیلاہٹ میں بیٹھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ وہ غم کی حالت اصلی کو اور بھی زیادہ خوف سے روشن کرتے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اکثر لوگ رستے کے دکھوں کے مارے جاتے ہی گر پڑے۔ چناں چہ ہم ظالم ستم گار تخت کے آس پاس کھڑے تھے اُن کے حوالے ہوگئے۔ بعض تو خوش نصیب تھے کہ رنج وعذاب سہتے سہتے دروازے کی طرف بھاگے۔ وہاں بی بی صابرہ خاتون اُن کے استقبال کے لیے منتظر کھڑی تھی۔ کیوں کہ جب ہم اندر گئے تو اس بے چاری کو چھوڑ گئے تھے۔ اس کی رفاقت ایسے وقت میں نہایت غنیمت معلوم ہوئی۔ چناں چہ اُس نے ہمیں اس کلبۂ احزان کے گرد ایک چکر دیا۔ جب پچھواڑے کی طرف آئے تو ایک بلندی نظر آئی۔ اس پر چڑھ کر دفعتہً معلوم ہوا کہ گویا ہم اس ماتم دورہ کی نکاس کی راہ پر گئے۔ اس بلندی پر اس نے کہا کہ فرزندو! یہاں ذرا ٹھہر کے دم لے لو کہ تمھارے ہوش وحواس ٹھکانے آجائیں۔ چناں چہ فی الحقیقت خمارِ غم کی سرگرانی سے آنکھیں ہماری جو زمین پر گی ہوئی تھیں، اب ذرا کھلتی معلوم ہوئیں اور ایک قسم کی خوشی محسوس ہوئی، جس نے زبانوں پر تسکین کا مزہ دیا۔ یا تو دنیا اندھیر معلوم ہوتی تھی یا ایسا معلوم ہوا گویا ہم چھاؤں میں ہیں۔ یہاں ہم نے اپنے ہم راہیوں کے شمار پر بھی خیال کیا کہ کتنے لوگ جزیرے میں داخل ہوئے تھے۔ چناں چہ اُن کی کثرت سے دل کو ایک اور قسم کی خوشی ہوئی جس کو تسلی سمجھنا چاہیے۔ ہر چند کہ یہ خوشی، جو اوروں کو مبتلائے غم دیکھ کر حاصل ہوئی تھی، معیوب ہے مگر اس وقت قابلِ عذر تھی، کیوں کہ وقت کو خیال کرو، یعنی دیکھو کہ ہم خود کس آفت میں مبتلا تھے۔ اسی واسطے ہم کو فقط اُن کے حالِ زار پر رحم نہ آیا۔ ہاں یہ افسوس آیا کہ ہائے ہم سب کیسی بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں گرفتار ہیں، بل کہ اس میں کچھ اُنس انسانیت اور رحم ہمدردی بھی شامل تھا۔

اگرچہ دل اُس وقت ایسے اندھیرے اور عالم مدہوشی میں تھا کہ اُسے کسی بات کا ہوش نہ تھا، مگر جوں جوں آگے بڑھے، ہوش میں آتا گیا۔ تھوڑی دور چل کر ایک دوسرے کو پہچاننے لگے، بل کہ ایک ایک کو غمگین دیکھ کر پوچھنے لگا کہ ہم کب ملے تھے اور وہ کیا مصیبتیں تھیں کہ جن کے لیے ہم

سب جمع ہوئے تھے؟ ہر ایک نے اپنی سرگزشت بیان کی۔ سارے ماجرے سن کر سب نے ایک دوسرے کی تکلیف کو تولا اور باہم مقابلہ کیا پھر آپس میں ہی رحم کر کے ایک دوسرے کے حال پر بہت افسوس کیے۔ غرض اس طرح غم ناک قافلے نے رفیقوں کو صبر و تسلّی کے توشے دے کر تھوڑی سی مصیبت کی راہ قطع کی۔ آخر ان درختوں کا تنگ رستہ ذرا کھلنا شروع ہوا اور ہوا بھی کچھ کچھ صاف ہونے لگی۔ تھوڑی دور سے صبح کا سفید غبار کی طرح اُڑتا نظر آیا۔ وہ ایسا رہ رہ کر اُبھرتا تھا جیسے کہیں دور بجلی چمکتی ہو۔ چکارے ذرا اس کے ماند تھے مگر باوجود اس کے دل کو فرحت بخشتے تھے۔ چناں چہ اس ملک میں اسے دل کا بہلاوا کہتے تھے۔ تھوڑی دیر میں یہ روشنی زیادہ نظر آنے لگی اور پھر زیادہ تر روشن اور دیر تک ٹھہرنے لگی۔ بعد اس کے وہ آہیں جنھوں نے اب تک زمین و آسمان کو دھواں دھار کر رکھا تھا، نسیمِ صبح کی سرسراہٹ بن گئیں اور تمام جزیرے پر جو دیو ہیبت کا سایہ چھایا ہوا تھا، وہ بھی کم ہونے لگا۔

اب ہم چلتے چلتے اس پایاب مقام پر پہنچے جہاں سے ہمیں پار اُترنا تھا۔ یہاں دیکھیں تو وہ ماتم زدہ بھی بیٹھے ہیں، جو پہلے ہمارے ساتھ ادھر اُترے تھے، اور پھر کلبۂ احزان کے دروازے سے گھبرا کر بھاگ گئے تھے، لیکن یہاں بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ جس طرح ساتھ ادھر آئے تھے، ساتھ ہی پھر دنیا میں دوبارہ پیدا ہوں، جس سے معلوم ہوکہ یہ بھی کلبۂ احزان کی تکلیفوں میں شریک حال تھے۔ اگر چہ اور طرف پانی بڑا گہرا تھا مگر ادھر بالکل پایاب تھا۔ جب ہم دریا اُترے تو تمام دوست آشنا استقبال کو آئے، کیوں کہ انھیں ہماری عمرِ دوبارہ کی مبارکباد کے لیے تسلّی بلا کر لائی تھی۔ ان میں سے بعض تو ہمیں اتنے دن تک جدا رہنے کے لیے ملامت کرتے تھے، بعض کہتے تھے کہ خیر جو ہوا سو ہوا، پھر اُدھر جانے کا ارادہ نہ کرنا۔ بعض دانش مندوں نے سفر کا حال بھی نہ پوچھا کہ مبادا پھر رنج تازہ ہو جائے، مگر یہ ہر شخص نے کہا کہ اگر تقدیر سے ایسا سفر پیش آئے تو صبر سے بہتر کوئی رفیق راہ نہیں۔ یہاں صبر نے چاروں طرف سے اپنی تعریفیں اور شکریے سن سن کر ہمیں تسلّی کے سپرد کر دیا۔ تسلّی نے اس پر تبسم کیا، تبسم کے ساتھ ہی اُدھر سے آسمان کا رنگ ارغوانی ہو گیا اور شبِ ماتم صبح ہو کر روزِ روشن بن گئی۔

حواشی

آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا:

۱۔ اس عمارت سے گویا ہی کاروبار مراد ہیں، انھی میں آیندہ یہ لوگ گزران کر کے اپنی قسمت کا لکھا پورا کریں گے۔

۲۔ کیسی ہی نعمت ہو، جب برابر مل جائے تو آخر دل سیر ہو جاتا ہے۔

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ:

۱۔ ایک قسم کا شکاری کتا ہے جسے ہندستانی زبان میں ''ٹیل ڈاگ'' کہتے ہیں۔

گلشنِ اُمید کی بہار:

۱۔ دیکھ لو، دنیا میں جوں جوں انسان کام یاب ہوتا ہے، اُس سے آگے کی کامیابیوں کی ہوس دل میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔

۲۔ انسان کی طبیعت کا عجیب حال ہے، جو ہوس پوری ہو جاتی ہے، وہ مزہ نہیں دیتی، اس سے آگے کے لطف دل میں ارمان اور ذوق پیدا کرتے ہیں۔

۳۔ جوں جوں حصولِ مراد میں دیر لگتی ہے، شوق زیادہ ہوتا جاتا ہے، اور اُمید بھی اس کے ملنے کے سامان سامنے دکھاتی جاتی ہے۔

۴۔ انسان جس مقصد کے لیے کوشش کرتا ہے، کسی سے کب کہتا ہے، اندر ہی اندر تدبیریں کرتا ہے۔

۵۔ اپنے کام کے آگے کسی اور کی احتیاج کی کون پروا کرتا ہے۔

۶۔ سچ ہے، بڈھوں کو جوانوں سے زیادہ ہوس ہوتی ہے۔

سیرِ زندگی:

۱۔ بہت سے گرم و سرد زمانے کے دیکھتا ہے، نشیب و فرازِ عالم کے طے کرتا ہے، بچپن سے

لے کر ساری جوانی تجربوں میں گزارتا ہے۔ جب گھس پس کر بڈھا ہو لیتا ہے تو ذرا آدمی بنتا ہے اور اس قابل ہوتا ہے کہ جو سنے یا دیکھے اسے کچھ سمجھ بھی سکے۔

۲۔ ابھی ایک طرف ناچ رنگ، شادی اور مبارک بادوی ہے، ابھی دوسری طرف رونے پیٹنے کی آواز آتی ہے۔ ابھی ایک گھر میں دولت و اقبال کا جوش وخروش ہے، ابھی ایک صدمہ ایسا پڑا ہے کہ ساری خوشیاں مٹی ہوگئی ہیں۔ ادھر آبادی ہے اُدھر بربادی ہے، ادھر ہوائے ترقی اور جوش و اقبال ہے، اُدھر ادبار کی آندھی ہے۔ ابھی عمر کا جہاز صحیح سلامت بادِ مراد پر چلا جاتا ہے، ابھی طوفانِ طلاطم میں غوطے کھا رہا ہے۔

۳۔ کمزور کشتیاں بچوں کے نازک جسم اور دھان پان سے بدن ہیں۔

۴۔ اس سے بچوں کے ماں باپ اور طبیب یا تیماردار مراد ہیں۔

۵۔ یہ جوانی کا عالم ہے اور دنیا کے حادثے ہیں جو کہ تلاشِ معاش اور راہِ ترقی میں اسے آتے ہیں۔

۶۔ یہ بڑے بڑے عالم فاضل، ڈاکٹر، پروفیسر، مولوی، پنڈت ہیں جو ہماری تعلیم میں مصروف ہیں۔

۷۔ فی الحقیقت دنیا کی ابتدا کس نے دیکھی ہے، جو آیا یہی چلتا ہوا کارخانہ دیکھا اور چلتا ہوا ہی چھوڑ جائے گا۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گی

۸۔ خدا کے معاملے غیب کے اندھیرے میں ہیں، کسی کی عقل نہیں دیکھ سکتی ہے۔

۹۔ انھیں دنیا کے مکروہات، جسمانی بیماریاں، دشمنوں کی برخلافیاں اور اپنی بد پرہیزیاں اور بے اعتدالیاں سمجھو۔

۱۰۔ یہ بااقبال اور کامیاب لوگ ہیں، جن کی دنیا میں بن آئی ہے۔

۱۱۔ نادانوں اور جاہل دوستوں سے خدا بچائے۔

۱۲۔ افسوس دنیا کے مزے ہمیں کیسا اندھا کر دیتے ہیں کہ انجام کے مکروہات اور خوف و خطر کچھ معلوم ہی نہیں ہوتے۔

۱۳۔ بھلا عمرِ رفتہ کب آسکتی ہے اور جوان یا بڈھا آدمی بچہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

۱۴۔ انھیں پرانی عمارتیں، بڑے بڑے فاضلوں اور مصنفوں کے تذکرے اور نامی گرامی لوگوں کی یادگاریں سمجھو یا پرانی عمارتیں، قدیمی مقبرے اور پرانے قبرستان۔

۱۵۔ یہی تمھارا جسمِ خاکی ہے جسے تم اچھی اچھی غذائیں کھلاتے ہو، ورزشوں سے تیار کرتے ہو، نہلاتے دھلاتے ہو، گرم سرد ہواؤں سے بچاتے ہو اور جوں جوں بڑھے ہوتے ہو وہ ناطاقت ہوتا جاتا ہے۔

۱۶۔ دولت مند عیش یا بڈھے زیادہ خطر کی حالت میں ہیں، مگر انھی کو غفلت زیادہ ہوتی ہے بل کہ مرنے کی بات سننے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

۱۷۔ راگ رنگ، قصے کہانیاں، کھیل کود کی باتیں کرنے میں ایسے لوگ دل بہلایا کرتے ہیں۔

۱۸۔ عمرِ رواں کا جہاز چلا جاتا ہے، دنیا گزر گاہِ عام ہے راگ رنگ، حسن و جمال، عیش و نشاط کے یہاں جمگھٹ ہیں۔ دیکھنا کہیں ان کے مزوں میں آ کر کود نہ پڑنا، ایسی چوٹ کھاؤ گے کہ ہسپتالوں تک جانے کے قابل بھی نہ رہو گے۔

۱۹۔ عقل و ادراک تمھیں ہر وقت بے اعتدالوں اور بد پرہیزیوں سے بچنے کو اشارہ کرتے رہتے ہیں مگر ان بے چاروں کی کون سنتا ہے۔

۲۰۔ یہاں سوئی اور مقناطیس کو نہ دیکھو، اپنے اشتیاق اور رغبت کی بداعتدالی پر خیال کرو۔

۲۱۔ بڈھوں کو زندگی بہت پیاری ہوتی ہے، کیسے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔

۲۲۔ یہ کاری گر حکیم جی ہیں یا ڈاکٹر صاحب ہیں۔

۲۳۔ حکیموں نے کہا سیانے کا علاج کرو، اس نے کہا حکیم کا علاج کرو۔

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا:

۱۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اپنی بے وقوفی یا بداطواری کو کوئی برا نہیں سمجھتا اسی واسطے اسے کسی نے نہیں پھینکا۔

علوم کی بدنصیبی:

۱۔ بڈ اور گھٹی ہوئی جگہ میں نہ نباتات بڑھتے ہیں، نہ ان کے پھول کھلتے ہیں، نہ پھل لگتے ہیں۔ سورج کی روشنی اور چلتی ہوا کو اس میں بڑا دخل ہے، یہ ہو تو سب ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔

۲۔ یہ بے ہودہ، بے دل اور نکتہ چیں معترض ہیں۔ ہنرمندوں کے ہنر ان کی آنکھوں میں

چھیتے ہیں اور خواہ مخواہ عیب لگا کر ان کی تصنیفوں کو خراب کرتے ہیں۔

۳۔ زمانہ کہ ہنر دشمن ہے، کیسا ہی اندھیر مچاوے مگر خود بخود ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔

علمیّت اور ذکاوت کے مقابلے:

۱۔ انگریزی میں وٹ اور لرنگ کا مباحثہ تھا، میں نے وٹ کے واسطے بہت خیال کیا، کوئی لفظ نہ ملا، ناچار ذکاوت لکھ دیا۔ اس میں جو لفظی قباحت اور معنوی کوتاہی ہے سو ظاہر ہے، مگر اور لفظ اتنا بھی نہ تھا۔ مجبوراً سب قباحتوں کو برداشت کیا، کیوں کہ غرض مطلب کے سمجھانے سے ہے۔

۲۔ دیکھو ہمارے بھائی بند جب آپس میں مباحثہ کرتے ہیں یا لوگوں پر اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں تو زیادہ تر حریف پر اعتراج کرتے ہیں اور اس کے خراب کرنے میں کوشش کرتے ہیں اور تصنیف و تالیف دکھا کر اپنے کمال کی تقویت نہیں کرتے۔

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار:

۱۔ اس میدان کو میدانِ دنیا سمجھ لو۔

۲۔ فی الحقیقت جو نامور ی اور ترقی کے خواہاں ہیں، اگر سلطنت، حکومت، دولت شجاعت، علمیت وغیرہ کے رستے سے جاتے ہیں تو خوف جان ہے اور اگر فنونِ کمال کے رستے لیتے ہیں تو حاسدانہ انواع و اقسام کی بدذاتیوں سے سدِ راہ ہوتے ہیں۔

۳۔ کوئی اوتار کہتا ہے، کوئی بادشاہ با اقبال۔

۴۔ اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی تھی؛ خصوصاً علم ہیئت کی کتابیں اور رصد خانے کی تعمیر اس کی شاہد حال ہے۔

جَنّتُ الحُمقَا:

۱۔ بات تو یہ ہے "خام خیالی سے خود پرستی پیدا ہوتی ہے۔

مرقعِ خوش بیانی:

۱۔ یعنی بے نقط یا منقوط، یا فقط اوپر ہی نقطے ہوں یا نیچے ہی نقطے ہوں، یا حروف اس کے ایک ایک الگ تحریر ہوں، یا سب کے سب ملا کر لکھے جا سکتے ہوں۔

مجلس ترقی ادب لاہور